عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی !!

إدارۂ اشرفیہ عزیزیہ کا ترجمان

ماہنامہ غزالی

ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ / ستمبر ۲۰۱۴ء

Reg No. P476

جلد: سیزدھم

شمارہ: 1

فہرست

فی شمارہ : 15/- روپے

سالانہ بدل اشتراک : 200/- روپے

ملنے کا پتہ : پوسٹ آفس بکس نمبر 1015، یونیورسٹی کیمپس، پشاور۔

ای-میل : physiologist72@hotmail.com

saqipak99@gmail.com

ویب سائٹ : www.darwaish.org

تمام گزشتہ شمارے ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔

اسلام میں مسجد کی اھمیت

(حضرت مولانا محمد اشرف خان صاحب سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ)

الحمد للہ وحدہ والصلوۃ و السلام علی من لا نبی بعدہ

حضرت محمد ﷺ جو دین لے کر آئے تھے وہ دین دنیا کی وحدت و یکجائی کا مدعی و حامل ہے۔ اسلام میں کلیسا و شاہی محل کی کوئی تفریق نہ تھی بلکہ ان کی مسجد ہی ان کا قصر خلافت اور ان کا منبر ہی ان کا تخت تھا۔ ان کی پوری زندگی مسجد کی بنیاد پر اٹھائی گئی تھی اور ان کی پوری اجتماعی و انفرادی زندگی مسجد کے محور کے گرد گھومتی تھی۔ مسجد صرف ان کی عبادت گاہ ہی نہ تھی بلکہ وہی ان کا دارالامارت تھا، وہی دارالشوریٰ تھا، وہی بیت المال تھا، وہی صیغۂ جنگ کا دفتر تھا، وہی درسگاہ، وہی خانقاہ اور وہی معبد تھا۔ مسجد سے ہی مسلمانوں کی شیرازہ بندی قائم تھی اور مسجد ہی مسلمانوں کے ہر قومی اجتماع کا مرکز تھا۔ اور نماز اس مرکزی اجتماع کی مرکزی رسم تھی۔ حضور ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عصرِ سعادت میں جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا یا کوئی ملی، قومی، سیاسی یا اجتماعی مشکل پیش آتی یا کسی خاص مذہبی بات کا اعلان کرنا ہوتا تو الصلوٰۃ الجامعہ (جمع کرنے والی نماز) کا اعلان کیا جاتا اور اس اہم اعلان کے بعد سب مسلمان مسجد میں جمع ہوتے، تحیۃ المسجد پڑھتے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے اور اس اہم بات سے آگاہ ہوتے اور اخلاص و روحانیت کی اس فضا میں اس معاملہ کے بارے میں اپنے مخلصانہ مشورے پیش کرتے اور اس طرح مسلمانوں کے مذہبی، اجتماعی، سیاسی مسائل بخیر و خوبی حل ہوتے۔

حضرات! حضور ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کے دورِ سعادت و برکت میں مسجد نہ صرف نماز پنجگانہ کی ادائیگی کا مقام تھا بلکہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی بھی سب سے بڑی درسگاہ و جامعہ تھی۔ مسجد نبوی ملت کا سب سے بڑا فعال ادارہ تھا۔ جہاں ایک طرف اسلامی تعلیم اور قال اللہ و قال الرسول کی مسند بچھی ہوئی تھی تو دوسری طرف ذکر و قرآن خوانی کے حلقے قائم تھے۔ تیسری

طرف صُفّہ کا چبوترہ تھا جو اسلام کی مخصوص مجاہدانہ خانقاہی زندگی کا نشان تھا۔ جس منبر نبوی ﷺ سے عبادات و اخلاق اور ارشاد و تلقین کے موتی بکھیرے جاتے تھے اسی سے حکومت و سیاست کی گتھیاں بھی سلجھائی جاتی تھیں، اقتصاد و تمدن کے نکتے بھی حل ہوتے تھے اور جنگ و سپاہ گری کے اصول بھی بیان ہوتے تھے۔ گویا مسجد نظمِ ملت اور اسلام کے نظریۂ وحدتِ ملی اور وحدتِ زندگی کا وہ نکتہ ارتکاز تھا جس سے مسلمانوں کی صلاح و فلاح کی ہر کڑی پیوست اور شیرازۂ حیات کا ہر تار بندھا تھا۔ اور مسلمانوں کے دائرہ حیات کے پرکار کا ہر خط اسی نکتہ کے گرد گھومتا تھا۔ اس وجہ سے قرنِ اول میں اسلامی زندگی کے جتنے شعبے بروئے کار آئے ان کا خام مواد اور اس کے چلانے والے مسجد نبوی کی تربیت گاہ سے وجود میں آئے۔ مسجد نبوی کی ہمہ گیری اور اس کے نظام تربیت کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ عصرِ صحابہ کی علمی، ادبی، مذہبی، عسکری، عدالتی، ہر شعبۂ زندگی کی مجلّہ عظیم شخصیتیں مسجد نبوی کے ماحول سے پیدا ہوئیں۔ وہ عبقری (Genius) اور عظیم اشخاص جو اس 'جامعۂ نبوت' سے فارغ ہوئے ان کا تنوع اور ان کے کارنامے شاہد ہیں کہ اسلام کا یہ مرکزی ادارہ شخصیت سازی اور مختلف علوم و فنون کی افادیت و اشاعت میں کتنا کامیاب تھا۔ اس درسگاہ کے فارغ التحصیل طلبہ میں اہم حضرات ابوبکر صدیقؓ و عمر فاروقؓ جیسے خلفاء و کشور کشا، حضرت عثمان ذوالنورینؓ اور زید بن ثابتؓ جیسے ماہرین و جامع قرآن، حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ و معاذ بن جبلؓ و ابن عباسؓ جیسے فقیہ و عالم۔ ابوہریرہؓ، عبداللہ ابن عمرؓ، ابوسعید خدریؓ جیسے محدث، ابوذرؓ و سلمان فارسیؓ و ابودرداءؓ جیسے زاہد مرتاض (ریاضت والے)، خالدؓ، ابوعبیدہؓ، سعد ابن ابی وقاصؓ، نعمان ابن مقرنؓ جیسے شجاع جرنیل و فاتح، عمرو ابن العاصؓ و معاویہؓ جیسے مدبر سیاسی زعماء پاتے ہیں۔ غرض ہر شعبۂ زندگی اور طبقۂ فکر و عمل کے بہترین قائدین کی ایک روشن مثال ہمیں مسجد نبوی کے ان فارغ طلبہ میں مل جاتی ہے جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ مسجد کی یہ مرکزی تربیت گاہ کتنی اہم اور نتیجہ خیز تھی۔

اقبال نے سچ کہا ہے۔

فقیراں تا بمسجد صف کشید ند ۔۔۔ گریبانِ شہنشاہاں دریدند

چوں آں آتش درونِ سینہ افسرد ۔۔۔ مسلماناں بدر گاہاں خؤید ند

(ترجمہ) فقیروں نے جب مسجد میں صف باندھی تو بادشاہوں کے گریبانوں کو پھاڑ ڈالا۔

اور جب سینوں کے اندر کا یہ جذبہ بجھ گیا تو مسلمان دوسروں کے دروازوں پر گیا۔

عصرِ صحابہ کے بعد گو قصرِ خلافت اور منبر و مسجد جدا ہو گئے لیکن مسجد کی عظمت و اہمیت و افادیت ہمیشہ مسلمانوں میں مسلمہ رہی۔ چنانچہ مسلمان فاتحین جہاں بھی گئے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قصرِ خلافت سے پیشتر انہوں نے مسجد بنائی اور آج بھی گو ان کی قصور و محلات کی بلندیاں سرنگوں ہو گئیں لیکن ان کی مساجد کے منبر و محراب ان کی دینی محبت اور مسجد سے تعلق پر گواہ ہیں۔ دورِ صحابہ میں مدائن (کسریٰ کا دارالحکومت) دمشق، حمص، فسطاط، قیروان وغیرہ اور یروشلم میں مسجدِ عمر اور جملہ ممالک محروسہ میں مساجد کی تعمیر ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اموی دور کی صرف دو مسجدیں ہی ان کی عظمت کے لئے کافی ہیں۔ ایک دمشق کی جامع اموی اور دوسری اندلس کا وہ لافانی شاہکار مسجد قرطبہ جس کے جلال و جمال نے شاعرِ مشرق، عظیم فلسفی اقبالؔ سے وہ وجد آور شاہکار نظم کہلوادی جو ان کی اردو نظموں کا کوہِ نور ہے۔ جس میں مسجد کے بارے میں اسلامی نظریۂ فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے انہوں نے مسجد سے خطاب کر کے اپنے یہ جاودانی اشعار کہے ہیں۔

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام، جس میں نہیں رفت و بود

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کی کشود

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل

تیری بنا پائیدار تیرے ستون بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل

تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہ جبرئیل

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیمؑ و خلیلؑ

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز

اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز

کعبۂ اربابِ فن! سطوتِ دینِ مبیں
تجھ سے حرمِ مرتبت اندلسیوں کی زمیں

اقبالؔ کے یہ اشعار گو مسجد قرطبہ کے بارے میں ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کم وبیش ہماری ہر عظیم مسجد پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ جہاں مسلمان فاتح گئے انہوں نے قصرِ خلافت سے پہلے مسجد کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ ہندو پاک میں بے شمار ایسی مساجد پائی جاتی ہیں جن کی ابتدا محمد بن قاسم سے ہوئی اور جن کی انتہا عالمگیرِ اعظم پر ہوئی، جن کی شاہی مسجد آج بھی لاہور کا تمغۂ امتیاز ہے۔

دہلی میں قطب الدّین ایبک کی بنا کردہ مسجد قوت الاسلام اور اس کے فن تعمیر کا عظیم و محیر العقول کارنامہ، قطب مینار، دہلی کی شاہجہان جامع مسجد، اورنگ آباد کی عالمگیری مسجد، مسجد بنارس سرینگر کشمیر کی عجیب وغریب مساجد، بھوپال کی تاج المساجد، ٹھٹھہ (سندھ) کی شاھی مسجد، غرض گلگت سے راس کماری تک اور برما کی سرحد سے نوشکی تک آپ بے شمار ایسی مساجد پائیں گے جو مسلمان بادشاہوں کی یادگار ہیں۔ خلافتِ عثمانیہ پانچ سو سال تک مسلمانوں کی سطوت کا نشان رہی۔ استنبول آج دنیا کی عظیم مساجد کا سب سے بڑا شہر ہے جن میں سلیمان ذی شکوہ کی جامعہ سلیمانیہ اپنی عظمت وجلال وحسن وزیبائی وسعت وشان میں دنیا کی نادرۂ روزگار تعمیرات میں سے ہے۔ ترکوں

نے دمشق، مصر اور جنوب مشرقی یورپ میں ہر جگہ مساجد بنائیں۔ وسطی یوگوسلاویہ (موجودہ بوسنیا) کے صرف ایک شہر Sarajevo (سرائیوو) میں ایک سو مساجد ہیں جن میں سے بعض ترک فنِ تعمیر کا اچھوتا نمونہ ہیں۔ جامعہ طولون، جامعہ ازہر، پینانگ کی مسجد غرض مشرق سے مغرب تک انڈونیشیا سے مراکش تک مسلمانوں کی مساجد کا آپ کو ایک تسلسل نظر آئے گا جن کا فنِ تعمیر تنوع کے باوجود اپنے میں ایک خاص یک رنگی اور وحدت رکھتا ہے۔

اس درازنفسی سے مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگی میں سب سے اہم چیز مسجد ہے۔ جس سے مسلمان کبھی غافل نہیں ہوئے اور جو مسلمانوں کی ملی زندگی کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے دورِ زوال میں مسجد کی ہمہ جہتی افادیت محدود ہو کر رہ گئی۔ ضرورت ہے کہ ہم مسجد کے اس اسلامی ہمہ گیر اور ہمہ جہتی نظام کو دوبارہ زندہ کریں۔ مساجد اور ائمہ مساجد کا صحیح مقام و منصب پہچانیں اور قرون اول کی طرح مسلمانوں کے تعلق کو مسجد کے ساتھ جوڑ دیں اور اسے صرف نماز تک محدود نہ رکھیں بلکہ ہر مسجد تبلیغ و دعوت، تعلیم و تربیت اور ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کا مرکز ہو اور ہماری مسجدیں ہماری معاشرتی زندگی کا مرکزی نکتہ ہوں۔ ہمارے دل مساجد میں اٹکے ہوئے ہوں۔ ہم مسجد کی زندگی سے حیات پائیں اور مسجد کی روح ہماری پوری ملی حیات کے رگ و پے میں سرایت کی ہوئی ہو۔ محلّہ کی مسجد سے ہمارے محلّہ کے جملہ ملی، اجتماع و انفرادی مسائل کا حل ہو۔ علاقہ کی جامع مسجد علاقے کی زندگی کا سامان ہو۔ شہر کی جامع مسجد پورے شہر کے لئے دینی حیات کا خون اور دنیاوی راحتوں کا ذریعہ ہو۔ غرض پھر سے ہم مسجد کے ساتھ متعلق ہو جائیں کہ جیسا حدیث میں مومن کامل کی مثال دی گئی ہے کہ اس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہوتا ہے اور مومن مسجد میں ایسا سرور و چین پاتا ہے جیسا کہ مچھلی تالاب میں۔

(یہ بیان حضرت مولانا صاحبؒ نے پشاور یونیورسٹی میں حکومتِ شارجہ کے تعاون سے تعمیر ہونے والی مسجد کے سنگِ بنیاد کے موقع پر دعائیہ تقریب میں کیا)

☆☆☆☆☆☆☆

ملفوظاتِ شیخ ۔ ڈاکٹر فدا محمد صاحب دامت برکاتہ (قسط۔۶۱)

(ظہور الٰہی فاروقی صاحب)

بننا درجہ بہ درجہ ہوتا رہتا ہے، ایک دن میں سب چیز حاصل نہیں ہو جاتی:

فرمایا کہ ہر چیز پورا فائدہ تب دیتی ہے جب وہ بن جائے۔ اور اگر بنے نہیں تو اس فائدہ کا حاصل نہیں ہوتا ہے۔ بننا درجہ بہ درجہ ہوتا رہتا ہے، ایک دن میں سب چیز حاصل نہیں ہو جاتی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دعاجُو رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے حضرت مولانا محمد اشرف صاحب سلیمانیؒ کے شیخ تھے، اُن سے ایک آدمی نے کہا کہ میں آتا جاتا رہتا ہوں، ذکر اذکار سیکھ رہا ہوں لیکن کوئی فائدہ ہوتا ہوا نظر نہیں آرہا۔ شاہ صاحبؒ نے اُس سے فرمایا کہ آپ ماں کے پیٹ سے اتنے ہی پیدا ہوئے تھے جتنے اب ہیں؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا کہ آپ اتنے بڑے ہو گئے تو بڑے ہونے کا پتہ آپ کو چلتا رہا، محسوس ہوتا رہا؟ اس نے کہا نہیں یہ تو پتہ نہیں چلا۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ایسے ہی اگر آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے سلسلے سے وابستہ ہو کر محنت کوشش شروع کر دے تو ترقی ہوتی رہتی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ آدمی کو پتہ بھی چل رہا ہو۔ اب کوئی آدمی کسی کو آج دیکھ لے اور پھر دس سال بعد دیکھ لے تو پورا فرق محسوس کر سکتا ہے لیکن جو روز روز اُس کو دیکھ رہا ہو تو نہ دیکھنے والے کو فرق محسوس ہوتا ہے اور نہ جس میں فرق آرہا ہو اُس کو محسوس ہوتا ہے، لیکن آدمی بتدریج آہستہ آہستہ ارتقاء کر رہا ہوتا ہے، بڑھ رہا ہوتا ہے اور اُس کی نشو نما ہو رہی ہوتی ہے۔ ایسے ہی رُوحانیت کا بھی حال ہے۔ شاہ صاحبؒ نے بھی اس بات کی آگاہی کے لئے فرمایا کہ اس کا آپ کو پتہ نہیں چلے گا۔

ایک پروفیسر صاحب تھے اُن کا رشتہ دار بیمار ہو گیا، وہ اس کو لے کر ہسپتال گئے۔ اُس کو دکھایا ایک جگہ، دوسری جگہ، ایمرجنسی، ایکسرے، یہاں لے جاؤ، وہاں لے جاؤ، خوب دوڑ دھوپ کی۔ ایک جگہ کھڑے تھے تو ڈاکٹروں نے کہا مریض کو چھوڑیں اور بیٹھ جائیں، اپنی فکر کریں۔ پروفیسر صاحب کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ ڈاکٹر کیا کہہ رہا ہے۔ یہاں تک کہ چکرائے اور گرے، فالج کا حملہ

ہوا اور جب شفا ہوئی بھی تو ہوش و حواس ختم تھے اور پاگل تھے۔ پروفیسر صاحب دوسرے کی فکر کر رہے تھے اور اپنا پتہ نہیں چل رہا تھا، مگر ماہر کی نگاہ نے دیکھ لیا کہ اُس سے زیادہ بیمار تو یہ ہے اور اُس کی بات ماننے میں جو تھوڑا سا پس و پیش کیا گیا اُس میں آدمی گر گیا۔ خود کو پتہ نہیں چلا کرتا کہ بن رہا ہے یا بگڑ رہا ہے۔ اس لئے سلاسل کی تربیت میں یہ بات ہے کہ وابستگی اختیار کر کے اپنے بارے میں پوچھتے رہنا ضروری ہوتا ہے، اپنی نگرانی کرانی ضروری ہوتی ہے اور اپنے آپ کو ماہرین کے سامنے رکھنا ہوتا ہے تا کہ جو زوال، گراوٹ آ رہی ہو اُس پر آگاہی ہوتی رہے، تب آدمی حفاظت میں ہوتا ہے۔ یہ بننا بھی آہستہ آہستہ ہوتا ہے اور اس میں بھی بننے اور بگڑنے کا پتہ ماہرین کو چلے گا اپنے آپ کو نہیں چلے گا۔ اس لئے جو حضرات سلوک و احسان کو یوں سمجھتے ہیں کہ تبدیلیاں ہمیں نظر آ جایا کریں، ہمیں محسوس ہو جایا کریں وہ بڑے پریشان ہوتے ہیں کیونکہ وہ اصلاح اور بننا ایک خاص چیز کو سمجھتے ہیں اور وہ اگر حاصل نہ ہو رہی ہو، نظر نہ آ رہی ہو تو بڑے پریشان ہوتے ہیں کہ رونا تو آیا ہی نہیں ہے، ذکر میں مزہ تو آیا ہی نہیں ہے، عبادت میں مٹھاس تو محسوس ہوئی ہی نہیں ہے، لہٰذا سمجھتے ہیں کہ ہم تو بن ہی نہیں رہے ہیں۔

جب اللہ والوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا نصیب ہو جائے تو آدمی میں دین کا فہم پیدا ہوتا ہے:

فرمایا کہ حضرت مولانا ظاہر شاہ صاحبؒ کے اللہ تعالیٰ درجات بلند فرمائیں، بہت بابرکت شخصیت تھے۔ رائے ونڈ میں ہم مغرب تا عشاء اُن کے پاس بیٹھتے تھے کیونکہ اہلِ علم تھے، اہلِ تصوف تھے اور ہمارے حضرت مولانا صاحبؒ کے خاص تعلق والے تھے۔ ہم تھوڑی دیر اُن کے پیر دبا دیتے تھے اور اس دوران وہ کچھ باتیں فرما دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ میں دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد پنجاب میں کسی جگہ امام ہو گیا، کوئی بہت بڑے خاندانی نوابوں کی مسجد تھی۔ فرمایا کہ میں نے درسِ قرآن شروع کیا تو بڑے نواب صاحب نے بھی بیٹھنا شروع کیا اور کچھ عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے فضل فرما دیا، زندگی ہی بدل گئی۔ نواب صاحب کے بیٹے کی شادی آ گئی۔ اُن کے خاندان میں شادی پر رنڈیاں بلانے اور تماشا کرنے کا رواج تھا۔ سارے علاقے کے لوگ آتے، تماشا دیکھتے، اس سے

اُن کی لیڈری چمکتی اور انتخابات میں اُن کی کوئی حیثیت بن جاتی تھی۔ اب بیٹے کی شادی آ گئی تو سارے خاندان والے جمع ہوئے مشورے کے لئے کہ شادی کیسے کریں گے؟ نواب صاحب نے کہا کہ اب تو جیسے ہزارے کے مولوی صاحب کہیں گے ویسے ہی کریں گے۔ فرمایا کہ میرے پاس مشورے کے لئے آئے، میں نے اُن کے پورے حالات کا جائزہ لیا اور اُس میں یہ بات سمجھ آئی کہ یہ لوگ اس قسم کی تقریبات کو اپنی سیاسی حیثیت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ فرمایا کہ میں نے اُنہیں مشورہ دیا کہ آپ کے بیٹے کی شادی کا ولیمہ ہم تین دن کریں گے۔ ان تین دنوں میں ہر دن مختلف علاقوں کے لوگوں کو بلائیں گے، لوگ کھانا کھائیں گے اور ساتھ ہی جلیبی والوں نے کڑاہی لگائی ہوگی اور ہر آنے والے کو ایک سیر جلیبیاں لے جانے کے لئے دیں گے۔ پھر ایسا ہی کیا گیا، تین دن ولیمہ ہوا اور ہر آدمی ایک ایک سیر جلیبیاں گھر لے گیا تو سارے مردوں، عورتوں، بچوں میں اُن کی خوب شہرت ہوئی اور بہت سیاسی دبدبہ قائم ہوا اور خرچہ بھی پہلے سے زیادہ نہیں ہوا جو وہ اُن فضولیات پر کرتے تھے۔

تو عرض یہ تھی کہ مال، جان اور وقت کا صحیح استعمال آدمی کو آجائے تو یہ دُنیا و آخرت کے خیر دلانے والی چیز ہے۔ اور یہ بات حاصل ہوتی ہے اللہ والوں کی صحبت میں۔ جب اللہ والوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا نصیب ہو جائے تو آدمی میں دِین کا فہم پیدا ہوتا ہے۔ ارشاد ہے:

یا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (التوبہ:۱۱۹)

(ترجمہ) اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور ہو جاؤ سچوں کے ساتھ۔

اللہ کی شان کہ جب کوئی کمربستہ کر دین کا کام کرنے کے لئے آگے بڑھے تو مالی وسائل تو دین کے کام کیلئے کوئی مسئلہ ھی نہیں ھے۔ وہ تو اللّٰہ تعالیٰ ایسی جگھوں سے دیتا ھے کہ آدمی کو اندازہ بھی نہیں ھوتا:

فرمایا کہ حضرت مولانا یوسف بنوری صاحبؒ کے زمانے میں ایک آدمی نے بنوری ٹاؤن کے مدرسے کے لئے پنکھے بھیجے۔ ایک دن وہ آدمی آیا اور کہنے لگا حضرت! یہ طلباء پنکھوں کو بے دریغ

چلاتے ہیں، اس طرح تو یہ خراب ہوجائیں گے۔ انھوں نے کہا جب آپ نے پنکھے دے دیئے تو اب آپ کا ان کے ساتھ کیا تعلق رہا اور کہا کہ اس کے پنکھے اٹھا کر اس کے حوالے کرو۔ دارالعلوم کوئی تمہارے پنکھوں اور چندوں کا محتاج ہے کہ ہم سوالی بنیں۔ اللہ کی شان کہ جب کوئی کمر باندھ کر دین کا کام کرنے کے لئے آگے بڑھے تو مالی وسائل تو دین کے کام کے لئے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ ایسی جگہوں سے دیتا ہے کہ آدمی کو اندازہ بھی نہیں ہوتا۔

جس معیار کو آج آپ لوگوں نے اپنے لئے بنایا ہے وہ تو پانچ لاکھ میں بھی نہیں ہو رہا، پچاس لاکھ میں بھی نہیں ہو رہا، یہاں تک کہ پانچ کروڑ میں بھی پورا نہیں ہو رہا:

فرمایا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ کسی آدمی پر فاقہ آئے اور وہ تین دن فاقہ برداشت کر لے اور کسی کو بتائے نہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے لئے ایک سال کی حلال روزی کا بندوبست فرماتا ہے۔ تین دن کے فاقے سے آدمی کی موت نہیں ہوتی، پینے کیلئے پانی تو مل جاتا ہے۔ آدمی سات دن تک فاقہ کرسکتا ہے اور ڈی ہائیڈریشن (پانی کی کمی) کا وقت مقرر نہیں ہے، لیول مقرر ہے۔ لیکن ایک آدمی ایک دن، دو دن، تین دن اس کے بغیر بھی گزارا کرلیتا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (حود:۶) کوئی زمین پر چلتا ہوا چوپایا ایسا نہیں ہے جس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو، اللہ کہتا ہے کہ یہ میرے ذمہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کیا ہوا ہے کہ روزی میں نے دینی ہے۔ وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا. (حود:۶) یعنی اُس کی قیام گاہ کا بھی اللہ تعالیٰ نے بندوبست کرنا ہے۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ جس معیار کو آپ نے بنادیا وہ تو پانچ لاکھ میں بھی نہیں ہورہا، پچاس لاکھ میں بھی نہیں ہورہا، یہاں تک کہ پانچ کروڑ میں بھی پورا نہیں ہورہا، مکان بن ہی نہیں رہا۔

دین کے لئے مال دینا اچھی بات ہے مگر دین کے لئے جان دینا اصل ہے:

فرمایا کہ ایک دفعہ گاؤں والوں نے والد صاحب کو یہ کہہ کر ابھارا ہوا تھا کہ گاؤں کے ایک دوسرے ڈاکٹر اقبال صاحب امریکہ گئے ہیں، انھوں نے اتنے پیسے مساجد کیلئے بھیجے ہیں، اتنے پیسے بیواؤں، غریبوں کے لئے بھیجے ہیں، اتنے دارالعلوموں کیلئے بھیجے ہیں۔ جب میں گاؤں گیا تو والد

صاحب نے یہ پوری داستان مجھے سنائی۔ میں نے کہا: ''جی اقبال نے تو دین کے لئے مال دیا ہے اور ہم نے تو دین کو جان دی ہوئی ہے۔'' والد صاحب خوش ہوئے اور کہا بس ٹھیک ہے۔ ہمارے بھائی صاحب سے کہا کہ تم لوگ ایسے ہی خیراتیں کرتے رہتے ہو، تمہارے پاس اضافی پیسے ہوا کریں تو اس کے پاس دین کے کام کیلئے بھیجا کرو۔ وہ ہمارے لئے کچھ نہ کچھ بھیجا کرتے تھے۔ تو دین کیلئے مال دینا اچھی بات ہے مگر دین کو جان دینا اصل ہے۔ اب ایک آدمی دارلعلوم کو چندہ بھیج رہا ہے اور دوسرے نے اپنا بیٹا داخل کیا ہوا ہے تو جس نے بیٹا دیا ہوا ہے اُس تک چندے والا نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ اسی چندے کی برکت سے تو ان کے کاروبار چل رہے ہوتے ہیں اور یہ اس غلط فہمی میں ہوتے ہیں کہ شاید ہمارے چندے سے مدارس چل رہے ہیں۔ ایسی بات قطعاً نہیں ہے بلکہ اہلِ مدارس کی دعاؤں سے آپ کے کاروبار چل رہے ہوتے ہیں۔

اللّٰہ کے ہاں اندھیر نگری نہیں ہے کہ آدمی نیک اعمال کر رہا ہو اور اسے جہنم میں ڈال دیا جائے بلکہ وہ اعمال صورتاً نیکی نظر آرہے تھے حقیقتاً نیکی نہیں تھے جن کا آخر میں اللّٰہ تعالیٰ بھرم کھول دیتا ہے:

فرمایا کہ مسلمان تو دنیا کے کام میں بھی اللہ کی رضا کے لئے جاتا ہے۔ لہٰذا یقین اور نیت یہ ہو کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے، وہی پالتا ہے اور اعمال صالحہ کی برکت سے عطا فرماتا ہے۔ مگر اعمالِ صالحہ پر اس کی نیت نہیں ہونی چاہئے کہ آدمی اعمالِ صالحہ دنیا درست ہونے کے لئے، برکت آنے کیلئے، حالات سنوارنے کے لئے، دنیا کی چیزوں کے ملنے کیلئے کرے۔ یقین تو یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ پالے گا، نیک اعمال پر پالے گا، اللہ تعالیٰ برکت دے گا تو نیک اعمال کی وجہ سے، رحمت ملے گی تو تقویٰ سے ملے گی، اعزاز ملے گا تو تواضع اور عاجزی سے ملے گا۔ لیکن اگر عمل کو اس نیت سے کرے کہ یہ چیزیں ملیں تو یہ شرک ہوا۔ عمل تو ہم خالصۃً اللہ کی رضا کیلئے کر رہے ہیں اگرچہ ان ساری باتوں کا ہونا بھی اس پر ہی ہے۔ یہ ہمیں پورا یقین ہے مگر عمل ہم ان چیزوں کے حاصل کرنے کیلئے قطعاً نہیں کر رہے ہیں۔ ہم تو اللہ کی رضا کیلئے کر رہے ہیں۔ یہ چیزیں ملیں، ملیں، نہ ملیں، نہ ملیں۔ ہمارے ایک ساتھی نے کہا کہ بس عمل کر کے اللہ پر چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ آدمی نیک عمل

کرتے کرتے جنت سے ایک بالشت رہ جاتا ہے پھر کوئی ایسا خراب عمل کرتا ہے کہ دوزخ میں جا گرتا ہے اور عمل کرتے کرتے جہنم سے ایک بالشت رہ جاتا اور کوئی نیک عمل کرتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس حدیث پر علماء نے بحث کی ہوئی ہے، یہ حدیث کوئی اندھیر نگری نہیں ہے کہ ساری عمر نیکی میں گزاری اور آخر میں اُٹھا کر اسے جہنم میں پھینک دیا۔ علماء نے بحث کی ہے کہ اصل میں وہ پہلے اعمال جو اس سے نیکی کی شکل میں ہو رہے تھے وہ صورتاً نیکی تھے حقیقتاً نیکی نہیں تھے۔ اور جس سے خراب اعمال ہو رہے تھے، وہ صورتاً خراب نظر آ رہے تھے حقیقت اس کی کچھ اور تھی۔ اللہ کے ہاں اندھیر نگری نہیں ہے کہ آدمی نیک اعمال کر رہا ہو اور اسے جہنم میں ڈال دیا جائے بلکہ وہ اعمال صورتاً نیکی نظر آ رہے تھے حقیقتاً نیکی نہیں تھے جن کا آخر میں اللہ تعالیٰ بھرم کھول دیتا ہے۔

جو کافر مدرسے کے انتظامی امور میں مداخلت نہ کرتا ہو اور یہ نہ کہے کہ ہم نے مسجد، مدرسے کے لئے چندہ دیا ہے تو آپ ہمارے گرجے ومندر کے لئے چندہ دیں گے تو اس سے چندہ لے سکتے ہیں:

فرمایا کہ حضرت مولانا حسن جان صاحبؒ نے ہمیں ایک واقعہ سنایا کہ ایک مدرسہ تھا، اس کے مالی وسائل کم ہوئے تو پاس ایک یہودی کی دکان تھی، اُس یہودی نے چندہ دیا ہے۔ اُس سے پوچھا کہ آپ کیوں مدرسے کے لئے چندہ دے رہیں ہیں؟ اُس نے کہا کہ ہمارے مذہب میں ہے کہ آسمانی کتاب کی خدمت کیلئے جو پیسہ لگتا ہے وہ بہت برکت والا ہوتا ہے، کاروبار میں برکت ہوتی ہے۔ چونکہ ہمارا علاقہ بہت دُور ہے تو میں نے سوچا کہ قرآن پاک بھی آسمانی کتاب ہے لہٰذا میں نے مدرسے کو چندہ بھیج دیا۔ فتاویٰ دیوبند میں لکھا ہوا ہے کہ جو کافر مدرسے کے انتظامی اُمور میں مداخلت نہ کرتا ہو اور یہ نہ کہے کہ ہم نے مسجد، مدرسے کے لئے چندہ دیا ہے تو آپ ہمارے گرجے، مندر کے لئے چندہ دیں گے تو اس سے چندہ لے سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم اُس سال جب حج کے لئے گئے تو وہ یہودی اور اُس کا پورا خاندان حرم شریف میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ سب خاندان والوں نے ایک ہی خواب دیکھا اور اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت سے نواز دیا اور قبول ہوئے۔

اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے بغیر دینا چاہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور سب چیزوں کے ساتھ نہ دینا چاہے تو کوئی دِلا نہیں سکتا، یہ فیصلہ تو اس کا ہے:

فرمایا کہ ایک فاتحہ کیلیئے جانا ہوا تو اس خاندان کا غم سے جو حال ہو رہا تھا دیکھ کر آدمی کا دل دکھتا تھا اور معیارِ زندگی کو دیکھ کر آدمی کو حیرت ہو رہی تھی۔ یہ معیارِ زندگی ان چیزوں سے بچا تو نہیں سکتا۔ سارا خوشی کا سامان پڑا ہوا ہے لیکن خوشی نہیں ہے، اللہ ایسے حالات لایا ہوا ہے کہ غم ہی غم ہے۔ ہر طرف خوشیاں بکھری پڑی ہیں، مکان کے فرش کو دیکھیں تو وہ خوش کرنے والا ہے، دیواروں کو دیکھیں تو وہ خوش کرنے والی ہیں، چھت کو دیکھیں تو اس کے نقش ونگار خوش کرنے والے ہیں لیکن خوشی نام کی چیز نہیں ہے۔ لباس، کھانا پینا، سواریاں، ساری کی ساری چیزیں ہیں، راحت اور خوشی دِلانے کے پورے کے پورے خزانے پڑے ہوئے ہیں لیکن راحت اور خوشی نہیں ہے، اللہ نے نہیں دی ہے۔ خوشی راحت تو روحانی چیز ہے، مادی نہیں ہے کہ پیسوں سے خریدی جا سکے، بازار سے لائی جا سکے، یہ تو معنوی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے بغیر دینا چاہے تو اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور سب چیزوں کے ساتھ نہ دینا چاہے تو کوئی دِلا نہیں سکتا، یہ فیصلہ تو اس کا ہے۔

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆☆☆

اطلاع

انشاءاللہ آئندہ ماہانہ اجتماع

بروز ہفتہ ۱۱/ اکتوبر ۲۰۱۴ء

خانقاہ میں منعقد ہوگا۔ بیان مغرب کی نماز کے بعد ہوگا۔

تعلق معَ اللّٰہ

(بیان پروفیسر ڈاکٹر محمد طارق صاحب۔ اعتکاف جولائی ۲۰۱۴ء فردوس مسجد، پشاور یونیورسٹی)

نَحمَدُہٗ وَ نُصَلِّی عَلیٰ رَسُولِہِ الکَرِیم. اَمَّا بَعد

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوفٌ عَلَیہِمْ وَلَا ھُمْ یَحزَنُوْنَ. اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ.

(ترجمہ) خبردار بے شک جو اللہ کے دوست ہیں ان پر ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

جو لوگ ایمان لائے اور ڈرتے رہے۔ (سورۃ یونس۔ آیت ۶۲۔۶۳)

محترم بزرگوں دوستو اور بھائیو! قیصر صاحب کی محبت ہے کہ ہر سال بلا لیتے ہیں اور آپ کی توجہ اور طلب ہے کہ کچھ کلمات بولنے کی توفیق ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور اللہ تعالیٰ میرے لئے اور آپ کے لئے آخرت میں مغفرت اور نجات کا ذریعہ بنائے۔ کیونکہ بول جب تک صرف بول ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے جب تک کہ وہ حال نہ بن جائے اور اس پر عمل نہ ہو جائے۔ لیکن معلومات ہونا بھی ضروری ہیں۔ اس لئے بولنے اور لکھنے کا ایک طریقۂ کار ہے۔ کوئی بولے گا اور کوئی سنے گا تو معلومات ہوں گی۔ بات معلوم ہوگی تو معمول میں آئے گی۔ عمل تب ہوگا جب آدمی کو ایک بات پتا ہوگی کہ یہ اللہ کا حکم ہے، اس کا اتنا اجر و ثواب ہے، اس کا اتنا فائدہ ہے، تب آدمی کا عمل کرنے کا جذبہ بنتا ہے۔ تقریریں اور بیانات آپ سنتے رہے ہوں گے، ہم بھی وہی باتیں کریں گے، تقریباً وہی باتیں بار بار ہوتی ہیں، تکرار ہوتی ہے اور تکرار ضروری ہے کیونکہ عربی کا ایک مقولہ ہے اِذَا تَکَرَّرَ تَقَرَّرَ۔ یعنی جس بات کی تکرار کی جائے اور بار بار دہرائی جائے وہ دل و دماغ میں قرار پکڑ لیتی ہے، ٹھہر جاتی ہے۔ جس طرح ہم جہری ذکر کرتے اور اس میں بار بار کہتے ہیں لا الہ الا اللہ، لا الہ الا اللہ حالانکہ ایک بار لا الہ الا اللہ کہہ دینا بھی کافی ہے لیکن بار بار کرتے ہیں اور خیال جماتے ہیں کہ اللہ موجود ہے اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور اللہ میرے ساتھ ہے تو روزانہ اس بار بار کے کہنے سے اور سالہا سال تک کہنے سے بالآخر یہ دھیان حاصل ہوتا ہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ ایک دفعہ یہ دھیان آدمی کو حاصل ہو جائے پھر نیکی کا کرنا آسان ہو جاتا ہے اور گناہ کا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دو آدمی کوئی گناہ کا کام کر رہے ہوں، مثلاً ایک مرد اور عورت ایک بند

کمرے میں بدکاری کر رہے ہوں اور ان کو یہ شبہ ہو جائے کہ ایک سوراخ سے کوئی چھوٹا بچہ انھیں دیکھ رہا ہے تو انھیں ہمت نہیں ہوتی، پہلے وہ اس کا بندوبست کرتے ہیں۔ اس چھوٹے بچے کا اتنا لحاظ ہوتا ہے کہ سارا جذبہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے حالانکہ وہ چھوٹا بچہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ پھر وہ خالقِ کائنات جس نے پیدا کیا اور جو ہر بات پر قادر ہے اس کا ہمیں اتنا لحاظ بھی نہیں ہوتا۔ گناہ کر رہے ہوتے ہیں اور یہ خیال نہیں ہوتا کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ ذکر کا بار بار کرنا اس دھیان کو جمانے کے لئے ہوتا ہے کہ آدمی کا ہر وقت یہ دھیان ہو کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اسی کو صوفیاء نے نسبتِ یادداشت کہا ہے یعنی اللہ کی یاد طاری ہو جائے۔ لہٰذا تکرار کرنا ضروری ہے۔ ایک جگہ ہے وَ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ. (الذاریات:۵۵) یعنی مذاکرہ کیجئے، نصیحت کرتے رہا کیجئے، یہ مؤمنین کو فائدہ دیتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى. (الاعلیٰ:۹)

یعنی نصیحت اور مذاکرہ کرتے رہا کیجئے نصیحت فائدہ دیتی ہے۔

ایک بزرگ تھے ان کا ایک سیدھا سادہ اور بھولا سا مرید تھا۔ شیخ صاحب ان پر بہت زیادہ التفات اور توجہ اور محبت کیا کرتے تھے۔ مریدین کو کبھی کبھی آپس میں رشک اور حسد ہوتا ہے جب شیخ صاحب کسی پر زیادہ توجہ کرتے ہیں تو باقی سوچتے ہیں کہ اس کو اتنی توجہ مل رہی ہے تو مجھے کیوں نہیں مل رہی۔ اس مرید سے بھی باقی مریدوں کو تھوڑا سا حسد ہوتا تھا کہ سادہ سا آدمی ہے اور زیادہ بات سمجھتا نہیں اور شیخ صاحب اس پر اتنی زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ کسی نے شیخ صاحب سے کہہ بھی دیا کہ آپ اس پر بہت زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ انھوں نے بات اِدھر اُدھر کر دی۔ ایک دن شیخ صاحب نے ہر ایک کو ایک ایک مرغی دی اور کہا کہ اس کو جا کر ذبح کر کے لاؤ لیکن خیال رہے کہ ایسی جگہ ذبح کرنا جہاں کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔ سارے مریدین مرغیاں لے کر گئے اور تھوڑی دیر میں واپس آ گئے۔ کسی نے دیوار کی اوٹ میں، کسی نے درخت کی اوٹ میں مرغی ذبح کی اور آ گئے جب کہ اس بھولے مرید کا کوئی اتہ پتہ نہیں ہے۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ باقیوں کو بھیجا کہ اسے ڈھونڈ کر لاؤ۔ اسے جو ڈھونڈ کر لائے تو مرغی اسی طرح ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہے اور باقی مریدین اس پر ہنس رہے تھے کہ اتنا سا کام اس سے ہوتا نہیں ہے کہ ایک مرغی ذبح کر کے لے آئے اور شیخ صاحب اس پر اتنی توجہ کرتے ہیں۔ شیخ صاحب نے اس سے پوچھا کہ آپ کیوں مرغی ذبح کر کے نہیں لائے۔ اس نے کہا کہ آپ نے فرمایا تھا کہ اسے ایسی جگہ ذبح کرو جہاں کوئی نہ دیکھ رہا ہو

اور میں جہاں کہیں بھی جاتا ہوں تو اللہ مجھے دیکھ رہا ہوتا ہے اس لئے میں نے ابھی تک مرغی ذبح نہیں کی۔ تب سارے مریدوں کو اندازہ ہوا کہ شیخ صاحب اس لئے اسے اتنی توجہ دیتے ہیں کہ اسے یہ بات حاصل ہے۔

دوسرا مشہور واقعہ ہے کہ ایک چور تھا اس کی بیوی کی وفات ہوگئی۔ اس کا ایک چھوٹا سا تین چار سال کا بیٹا تھا۔ اب اسے مسئلہ درپیش ہوا کہ جب وہ اپنے کام پر یعنی چوری کرنے اِدھر اُدھر جائے تو اس بچے کا کیا کرے۔ اس نے سوچا کہ چھوٹا بچہ ہے اور سنبھالنا مشکل ہے لہٰذا اس سے جان چھڑانے کے لئے اسے کسی مدرسے میں داخل کرنا چاہئے اور جب بڑا ہو جائے تو پھر اپنے ساتھ لگا لیں گے، ابھی تو یہ ہمارے لئے مصیبت ہے۔ اس نے بچے کو مدرسے میں داخل کر دیا۔ چار پانچ سال بعد جب وہ بڑا ہو گیا تو اس کے باپ کو اندازہ ہوا کہ اب یہ اتنا سیانا ہو گیا ہے کہ اسے اپنے ساتھ کام پر لگا سکتے ہیں۔ اس نے مدرسے کے استاذ صاحب سے کہا کہ اب میں اسے مدرسے سے نکالنا چاہتا ہوں۔ استاذ صاحب نے کہا کہ یہ تو بڑا ذہین، قابل اور ہوشیار بچہ ہے اور سبق میں بڑا تیز ہے، اسے بہت فائدہ ہوگا، آپ اسے نہ لے جائیں۔ بہر حال اس کا باپ اپنی مجبوری کے بہانے وغیرہ کر کے اسے مدرسے سے نکال کر لے گیا۔ اگلی رات جب وہ چوری کے لئے جانے لگا تو بچے کو ساتھ لے گیا۔ دن کو اس نے ایک گھر منتخب کیا تھا اس پر رات کو نقب لگائیں گے کہ یہاں سے مال ہاتھ آنے کی توقع ہے۔ پرانے زمانے میں چور نقب لگایا کرتے تھے۔ دیوار میں سوراخ کر کے اندر گھسنے کو نقب لگانا کہتے ہیں۔ گلی کے سرے پر چور نے اپنے بچے کو کھڑا کر دیا اور کہا کہ میں اس گھر میں نقب لگا کر اندر جاؤں گا اور جب کوئی دیکھنے لگے تو تم مجھے آواز دینا کہ کوئی دیکھ رہا ہے۔ بچہ گلی کے سرے پر کھڑا ہو گیا اور دیکھنے لگا۔ اس کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا باپ تو چوری کر رہا ہے۔ مدرسے میں اتنا عرصہ گزار کر اسے اتنی بات حاصل ہوگئی تھی کیونکہ قابل بچہ تھا۔ ادھر اس کے باپ نے اوزار چلانے شروع کئے دیوار میں سوراخ کرنے کے لئے ادھر بچے نے آواز لگائی: ''ابّا جان! دیکھ رہا ہے۔'' چور کا دل بہت کمزور ہوتا ہے۔ ایک تو ڈاکو ہوتا ہے اور ایک چور ہوتا ہے۔ چور بڑا ڈرپوک ہوتا ہے۔ اس نے جوں سنا کہ دیکھ رہا ہے تو بھاگا اور بچے کو بھی کہا کہ بھاگو۔ کافی دیر بھاگتے رہے اور جب ذرا محفوظ جگہ پر پہنچ گئے اور اسے تسلی ہوگئی کہ پیچھے کوئی نہیں ہے تو اس نے اپنے بیٹے سے پوچھا کہ کون دیکھ رہا تھا۔ بیٹے نے کہا: ''ابا جان! اللہ دیکھ رہا تھا۔'' بس اس چور کے بھی دل پر چوٹ لگی، اس کا

بھی فیصلہ ہو چکا تھا، جتنا عرصہ اس نے بچے کو مدرسے میں رکھا اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس کی ہدایت کا بھی فیصلہ فرما دیا اور اس نے توبہ تائب ہو کر بچے کو پھر مدرسے میں داخل کر دیا۔ اس بات کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کس کا فیصلہ کب ہو جائے۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک آدمی فوت ہو گیا جو بہت گناہ گار تھا اور اس کو بہت عذاب ہوتا تھا۔ اس کا چھوٹا بچہ تھا۔ جس دن اس کی ماں اس کو مسجد میں سبق شروع کرانے لے گئی اور اس بچے نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا تو اس مردے سے عذاب ہٹا دیا گیا۔ فرشتوں نے پوچھا یا اللہ اس کا عذاب ہٹانے کی کیا وجہ ہوئی؟ اللہ نے کہا کہ اس کا چھوٹا بچہ زمین پر میرا نام لے رہا ہے مجھے حیا آتی ہے کہ اس کے باپ کو عذاب دوں۔ نیک اولاد بھی صدقۂ جاریہ ہوتا ہے۔ پیچھے سے دعائیں ہوتی رہتی ہیں۔ کیا پتہ کس وقت کسی کی نجات کا فیصلہ ہو جائے۔

تکرار کی بات ہو رہی تھی کہ اس سے یہ دھیان حاصل ہو جائے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ آدمی بازار میں جا رہا ہو اور باپ، بڑا بھائی یا کوئی ایسا آدمی ساتھ ہو جس سے اس کو تھوڑی سی حیا اور لحاظ ہو تو بازار میں کسی نامحرم عورت کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتا کہ یہ بڑا کیا کہے گا۔ ہمیں اللہ کا اتنا بھی لحاظ نہیں ہوتا جتنا اپنے باپ کا یا کسی بڑے کا لحاظ ہوتا ہے۔ یہ تب ہوتا ہے جب آدمی پر یہ دھیان طاری ہو جائے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور اللہ کی عظمت، ہیبت، جلال کا دھیان ہو کہ اللہ کو مجھ پر اتنی قدرت ہے، ویسے مثال کے طور پر آدمی کہہ سکتا ہے کہ جیسے چیونٹی کو ہاتھ میں مسل دینا ورنہ کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ اگر اللہ ہمیں اپنے گناہوں پر پکڑنا چاہے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ یہ تو اس کا حِلم ہے۔ دوسرے یہ تکوینی ترتیب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو حساب کتاب کی جگہ نہیں بنایا۔ اس کے لئے ایک جگہ مقرر کی ہوئی ہے کہ وہاں حساب کریں گے۔ تب تک کرتے رہو۔ آخر کب تک کرو گے، ایک دن میرے پاس آنا ہے، پھر دیکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک حکمتِ بالغہ ہے۔ ایک نظام بنایا ہوا ہے۔ ورنہ اگر ایک فرشتہ آدمی پر مسلط کر دیا جائے کہ ذرا انسان غلط کام کرے تو سر پر ڈنڈا پڑے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی آدمی گڑ بڑ کرے۔ سارے ٹھیک ٹھاک پھر رہے ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہوا ہے۔

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَ تَقْوَاهَا (الشمس:۸)

نیکی کا بھی الہام کر دیا ہے اور بدی کا بھی۔ آدمی کو پتا ہوتا ہے کہ یہ غلط ہے اور یہ ٹھیک ہے۔ اختیار بھی دیا ہوا ہے اور چھوڑا ہوا ہے۔ کبھی کبھار دنیا میں بھی سزا ہو جاتی ہے ورنہ عمومی طور پر حساب کتاب

آخرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے گناہوں کو دھونے کے لئے کبھی کبھی دنیا میں بھی پکڑ ہو جاتی ہے۔ اکثر اصول یہ نہیں ہے۔

شروع میں آیت مبارکہ پڑھی اَلَآ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ. یعنی جو اللہ کے خاص دوست اور اللہ والے ہوتے ہیں ان کو نہ غم ہوتا ہے اور نہ خوف ہوتا ہے۔ اور وہ کون لوگ ہیں؟ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ. جو ایمان لائے اور پھر صرف ایمان تک بات نہیں بلکہ آگے وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ جنھوں نے تقویٰ کو اختیار کیا۔ تو اللہ سے تعلق بنانے کی ضرورت ہے، دوستی کا تعلق۔ مسلمان سارے ہی ایک درجے میں اولیاء اللہ یعنی اللہ کے دوست ہیں، چونکہ ایمان لائے ہیں تو اس کو مانتے ہیں، اس کو صوفیاء ولایتِ عامہ کہتے ہیں۔ عام ولایت سب مسلمانوں کی ہے۔ آیت میں ہے۔

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ آمَنُوا یُخۡرِجُھُمۡ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوۡرِ (البقرۃ:۲۵۷)

اللہ دوست ہے ان کا جو ایمان لائے، نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف۔

یہ ولایتِ عامہ تو سارے مسلمانوں کی ہوگئی۔ پھر ولایتِ خاصہ ہے جو کہ اک خاص تقرب اور اللہ کا تعلق ہوتا ہے۔ اس کے لئے ایمان کے ساتھ تقویٰ کی شرط ہے۔ اللہ سے تعلق بنانا کیوں ضروری ہے؟ اللہ رب العالمین ہے، خالق ہے، مالک ہے، پیدا کرنے والا ہے، رازق ہے، ساری نعمتیں اس نے عطاء کی ہوئی ہیں اور عطاء کر رہا ہے مسلسل۔ ان سب باتوں پر جب آدمی غور کرے تو اللہ کی حقیقت آدمی پر کھل جاتی ہے اور پھر اس سے تعلق بنانے کو دل کرتا ہے۔ پھر تعلق بنانے کے مختلف درجات ہیں۔ پہلے درجے میں تعلق یقین کا بنتا ہے کہ یہ یقین حاصل ہو جائے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اللہ ہی سے ہو رہا ہے، جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ ہی کر رہے ہیں، انسان اور غیر اللہ کچھ بھی نہیں کر سکتے جب تک اللہ کا ارادہ نہ ہو۔ اللہ اگر ایک کام کرنا چاہے اور ساری مخلوقات اس کو روکنا چاہے تو روک نہیں سکتیں۔ اور اللہ اگر نہ کرنا چاہے اور ساری مخلوقات اس کو کرنا چاہیں تو کر نہیں سکتے جب تک اللہ نہ چاہے۔ آپ کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہے اور ساری مخلوقات مل کر وہ فائدہ پہنچانا چاہیں تو مل کر نہیں پہنچا سکتیں جب تک اللہ کا ارادہ نہ ہو۔ ساری دنیا کی مخلوقات آپ کو نقصان پہنچانا چاہیں اور ذلیل کرنا چاہیں اور اللہ نے عزت کا اور نفع کا فیصلہ کیا ہو تو کوئی ذلیل نہیں کر سکتا۔ تو یہ پہلے درجے کا تعلق ہے کہ یقین پیدا ہو جائے۔ کسی نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اگر اللہ تیر انداز ہو، آسمان کمان ہو جائے اور زمین کے سارے درخت تیر ہو جائیں تو پھر بچنے کی کیا

صورت ہے؟ فرمایا بچنے کی صورت یہ ہے کہ انسان اللہ کے پہلو میں آجائے۔ تیرانداز اپنے پہلو میں کھڑے آدمی کو تو نہیں مارتا۔ اس کے لئے تو دور ہونا ضروری ہے۔ تیرانداز کی بغل میں آگئے تو اس سے حفاظت ہوگئی۔ یہ جو ہم پڑھتے ہیں

لَا مَلْجَاءَ وَ لَا مَنْجَاءَ مِنَ اللّٰہِ اِلَّا اِلَیْہِ .

کوئی بچانے والا نہیں، کوئی نجات دینے والا نہیں اللہ سے سوائے اللہ کے۔

یہ یقین دل میں پیدا ہو جائے تو پھر کسی غیر اللہ کا ذرا بھی دل پر اثر نہیں آتا۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کو قتل کرتے وقت حجاج بن یوسف نے دربار میں کھڑا کرتے ہوئے کہا کہ میں تمہیں قتل کرنے والا ہوں تاکہ ان پر رعب آجائے اور ہیبت ہو اور وہ معافی مانگ لیں۔ صحابہؓ ایسے لوگ تھے جو اصول اور مؤقف پر جان دیتے تھے پر بات تبدیل نہیں کرتے تھے۔ ایک دوست نے کہا کہ میرے دل میں آیا کہ اگر ہم بھی حضور ﷺ کے زمانے میں ہوتے تو ہم بھی اتنی قربانیاں دیتے، اس میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ صحابہ کو اتنی شان دی ہوئی ہے کہ بڑے سے بڑا ولی بھی ایک ادنیٰ صحابی کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہوسکتا۔ کہتا ہے کہ میں خواب دیکھتا ہوں کہ ہم ایک جیپ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور چڑھائی پر چڑھ رہے ہیں اور حضور ﷺ بھی بیٹھے ہوئے ہیں، صحابہ کرامؓ بھی بیٹھے ہیں اور جیپ چڑھ نہیں سکتی اور واپس جانے لگتی ہے، بڑی سخت ڈھلوان ہے۔ کہتا ہے ہم سب جیپ سے کود پڑے کہ کوئی پتھر وغیرہ رکھ کر اس کو پیچھے جانے سے روک لیں، مجھے کچھ نہ ملا تو میں واپس آیا اور دیکھا کہ صحابہ کرامؓ نے جیپ کے ٹائروں کے پیچھے سر رکھے ہوئے تھے۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ صحابہ کرامؓ ویسے تو صحابہ کرام نہیں ہیں کہ میں کوئی چیز ڈھونڈ رہا ہوں ٹائر کے پیچھے رکھنے کے لئے اور ادھر صحابہؓ نے سر رکھے ہوئے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ کیا کہ وہ عام لوگ نہیں تھے بلکہ ارواح میں سے چنے ہوئے لوگ تھے جن کو حضور ﷺ کی رفاقت اور صحابیت کے لئے قبول کیا ہوا تھا۔ ہم جیسے لوگ ان کے مقام کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ تو ایسے لوگ تھے صحابہ کہ جان دیتے تھے بات سے نہیں پھرتے تھے۔ حجاج کا بھی خیال ہوا کہ میں اسے ڈرا دوں گا کہ میں تمہیں قتل کر رہا ہوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ اگر میں تمہیں زندگی اور موت کا مالک سمجھتا تو تمہیں اپنا معبود نہ بنا لیتا۔ میری زندگی اور موت کا مالک تو اللہ ہے۔ حجاج نے جلاد کو حکم دیا۔ اس نے تلوار ماری تو بہت زیادہ خون بہا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ میں تو لوگوں کو قتل کراتا ہوں، ان کا

خون نہیں نکلتا۔ اس نے درباری طبیب سے پوچھا کہ اس کا اتنا زیادہ خون کیوں نکلا۔ درباری طبیب نے کہا کہ اس سے پہلے جن لوگوں کو آپ قتل کراتے رہے ان کے دل پر آپ کا خوف اور موت کی دہشت طاری ہوتی تھی جس سے ان کا خون خشک ہو جاتا تھا جب کہ ان کے دل پر موت کا ذرا بھی خوف اور دہشت نہیں تھی۔ موت تو ان کو محبوب تھی۔ اللہ کی رضا کے لئے جان دینا تو ان کو لئے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

ابو ہریرہؓ وفات پا رہے تھے۔ جب ان پر حالتِ نزع طاری ہو رہی تھی تو گھر والی نے رونا شروع کر دیا 'واحزنا واحزنا'۔ ہائے غم ہائے غم۔ حضرت ابو ہریرہؓ خوشی سے کہہ رہے تھے 'وَاطربا وَاطربا' واہ خوشی واہ خوشی۔ یہ واقعہ بھی شاید انھی کا ہے یا کسی اور صحابی کا ہے کہ جب موت واقع ہونے لگی تو کہا کہ آج شام حضور ﷺ سے ملاقات ہوگی، اگر کسی کو کوئی پیغام دینا ہو تو دے دیں۔ اتنا انھیں یقین ہوتا تھا۔ یہ تو عارضی دنیا اور فانی زندگی ہے، اصل تو اس کے بعد شروع ہونے والی ہے۔ اتنا آدمی کو یقین ہو کہ اس کے لئے موت خوشی کا سامان ہو۔

اَلْمَوْتُ جَسْرٌ یُوْصَلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ

موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست سے ملا دیتا ہے۔

اللہ کی ملاقات اور اللہ کا دیدار تو موت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے مرنا ضروری ہے۔

پشتو کا شعر ہے۔

دیدن دہ سر پہ بدلہ دے

چہ سر ساتی خاورے بہ اوکی دیدنونہ

لوگ اس کو عشق مجازی میں لیتے ہیں۔ یہ تو عشقِ حقیقی کا شعر ہے کہ جب جان دے گا تو دیدار ہوگا۔ جو سر کو بچائے گا وہ خاک دیدار کرے گا۔ یہ تو اٹل حقیقت ہے کہ زندگی موت، نفع نقصان سب کچھ اللہ کی قدرت میں ہے۔ یہ اللہ کے ساتھ یقین کا تعلق ہے۔ اس سے بڑھ کر اگلے درجے کا تعلق پھر عشق و محبت کا تعلق ہے۔ جب آدمی تھوڑی اور محنت کرے تو دوسرے درجے میں عشق کا تعلق پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ عشق ہو جائے۔ محبت کا تعلق یقین کے تعلق سے قوی ہے۔ اس میں اعمال کا کرنا، گناہ سے رکنا دل کی خواہش بن جاتی ہے۔ عام طور پر لوگوں کا دنیاوی عشق میں تجربہ ہوا ہوتا ہے کہ محبوب جو کچھ کہے انسان کہتا ہے کہ بس اسی کو پورا کرنا ہے۔ رات کے دو بجے ملاقات کے لئے بلایا ہے تو ساری رات نیند

نہیں آتی اور وقت سے گھنٹہ پہلے وہاں پہنچا ہوتا ہے۔ یہ دل کا ایک خاص تعلق ہے۔ یہی تعلق اگر اللہ کے ساتھ ہو جائے تو نیک اعمال کا کرنا آسان اور گناہ کا کرنا مشکل۔ اقبال نے کہا ہے کہ

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے؟ ہاں نیند تمہیں پیاری ہے

اللہ سے پیار اور عشق ہو جائے تو سخت سردی میں گرم بستر چھوڑنا آسان اور ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا آسان کیونکہ اب تو عشق کا تعلق ہو گیا ہے۔ تو اس پر آدمی محنت کرے۔

اللہ سے عشق کیوں کیا جائے؟ اللہ کو نہ دیکھا ہوا ہے نہ کچھ اور پھر عشق کیسے ہو؟ عام طور پر انسان کا مشاہدہ پر یقین ہوتا ہے۔ مثلاً کسی چیز کو دیکھتا ہے، خوبصورت ہو تو پسند آتی ہے، خوبصورت منظر، خوبصورت نظارہ، خوبصورت کپڑے، خوبصورت انسان پسند آتے ہیں، ان کی طرف کشش ہوتی ہے۔ حالانکہ ان ساری چیزوں میں جو کشش ہوتی ہے اور ان ساری چیزوں میں جو حسن ہے درحقیقت اس میں ذاتِ ذوالجلال کی تجلی ہے۔ اسی لئے انسان کی تسلی نہیں ہوتی چاہے جتنی بھی دنیاوی چیزوں سے دل لگالے اور وہ اس کو حاصل ہو جائیں کچھ عرصہ بعد اس سے دل بھر جاتا ہے اور کوئی اور چیز پسند آجاتی ہے۔ جیسے بچے کو بازار میں ایک کھلونا پسند آ جائے تو وہ روتا ہے جب تک کہ اس کو مل نہ جائے لیکن وہی کھلونا جب اس کو مل جائے تو وہ گھنٹہ، آدھ گھنٹہ کھیل کر اسے پھینک دیتا ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ یہ دنیا کی چیزیں کھلونے ہیں۔

اے مصور تیرے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں
کیا تصویر بنائی میرے بہلانے کو

اللہ تعالیٰ نے ہمارے بہلانے کو ایک نظام بنایا ہوا ہے۔ یہ ہمارے کھلونے ہیں، کسی کو خوبصورت لڑکی پسند آتی ہے، کسی کو حیات آباد میں بنگلہ پسند آتا ہے کسی کو ڈیفنس میں، کسی کو نئے ماڈل کی گاڑی پسند آتی ہے، وہ اس کا کھلونا ہے، کسی کو عہدے، کرسی، وزارت کی طرف کشش ہوتی ہے تو وہ اس کا کھلونا ہے۔ جتنی بھی دنیا کی رعنائیاں ہیں، خوبصورتیاں ہیں دراصل ان میں ذاتِ ذوالجلال کی تجلی ہے۔ انسان کو ان کی طرف جو کشش ہوتی ہے وہ بنیادی طور پر اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ یومِ الست کو جو دیدار کیا ہوا ہے وہ کشش ابھی تک اس کے ذہن میں ہے۔ ازل میں جب ساری روحوں کو پیدا کیا اور پوچھا

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (الاعراف:۱۷۵) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب سے پہلے حضور ﷺ نے جواب میں 'بلٰی' کہا یعنی 'کیوں نہیں'، آپ ہمارے رب ہیں۔ پھر ان کی اقتدا میں ساری روحوں نے 'بلٰی' کہا۔ لہٰذا حضور ﷺ ازل سے سارے انسانوں کے رہنما اور پیشوا ہیں۔ تو وہ الست کا جو جلوہ دیکھا ہوا ہے اس کی طرف انسان کو کشش ہوتی ہے۔ ساری چیزوں میں جو خوبصورتی ہے وہ اللہ کی خوبصورتی ہے۔ اس لئے جب وہ چیز حاصل ہوتی ہے وہ اصل میں تو وہ ہے نہیں اس لئے کچھ عرصہ بعد اس کی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً آدمی کو کوئی خوبصورت پسند آجائے تو سمجھتا ہے کہ یہ نہ ملی تو اور دنیا میں کیا رکھا ہے لیکن جب اس سے شادی ہو جائے کچھ عرصہ ساتھ رہے تو وہ کشش نہیں رہتی، اس کی کشش ختم ہو جاتی ہے کیونکہ درحقیقت انسان کو جس خوبصورتی کی تلاش ہے یہ وہ چیز تو ہے نہیں۔ اس لئے انسان کے اس جذبے کی تسلی سوائے جنت کے اور اللہ کے دیدار کے ممکن نہیں ہے۔ چاہے جتنی بھی خوبصورتیوں کو اور چیزوں کو حاصل کرنا چاہیں کر لیں گے لیکن کچھ عرصے بعد کشش ختم ہو جائے گی۔ جتنے خوبصورت نظارے ہوں، لوگ کالام جاتے ہیں، ناران جاتے ہیں، کاغان جاتے ہیں، ایک دفعہ، دو دفعہ، دس دفعہ، آخر سوچتا ہے کہ کیا بار بار ان کو دیکھنا، ایک تالاب ہے اور پہاڑ ہیں اور درخت ہیں، ان کو کیا بار بار دیکھنا۔ کوئی خوبصورت کلام ہو، نغمہ ہو اس کو آپ سن لیں، پانچ دفعہ، دس دفعہ، بیس دفعہ، بس پھر کہتا ہے کہ کیا بار بار سننا۔ انسان کی فطرت میں یکسانیت سے اکتاہٹ ہے۔ دنیا میں انسان کے جذبۂ عشق کی اور محبت کی تسلی ہے ہی نہیں۔ جنت میں انسان کیوں نہیں اکتائے گا؟ وہاں بھی تو درخت ہیں، میوے ہیں، نہر ہے، باغات ہیں، حوریں ہیں۔ ایک بیان میں مولانا طارق جمیل صاحب نے کہا کہ وہاں انسان اس لئے نہیں اکتائے گا کہ جنت کی خوبصورتی جامد نہیں ہے، ہر آن اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، حوروں کے حسن میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، باغات محلات کے نظاروں میں بھی تبدیلیاں آرہی ہیں۔ جیسے بعض تصویریں ہوتی ہیں جن کو آپ ایک طرف سے پکڑیں تو ایک طرح نظر آتی ہیں اور دوسری طرف سے پکڑیں تو دوسری طرح نظر آتی ہیں اسی طرح اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں کا بھی اندازہ نہیں کہ وہ کس جہت سے کس طرح نظر آئیں گی، اس کے اعداد و شمار کی حد نہیں۔ اس لئے انسان کے جذبۂ محبت کی تسلی اس دنیا میں ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اس کو مجاز میں ڈھونڈنا بھی نہیں چاہئے۔ ضروری ہے کہ اس عشق کے جذبے کو کہ جو آدمی کو آگ میں کودنے پر راضی کر لیتا ہے، جس طرح ابراہیم علیہ السلام آگ میں کود پڑے اور اقبال نے اپنے شعر میں کہا۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

تو وہ عشق کا تعلق تھا جس کی وجہ سے آگ میں کود پڑے ورنہ اگر آدمی سوچے تو آگ میں تو جلنا ہے۔ لیکن جب بات عشق و محبت کی آجائے پھر جلنا، مرنا یہ باتیں ثانوی یعنی Secondary ہو جاتی ہیں۔ اور عقل ابھی کنارے پر کھڑی سوچ رہی ہے کہ کودوں کہ نہ کودوں۔ تو یہاں عقل کا کام نہیں ہے کیونکہ عشق میں عقل کے فیصلے نہیں ہوتے۔ ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا جانے لگا تو جبرائیلؑ نے کہا کہ اے اللہ میں اس کی مدد کروں، تیرا پیغمبر ہے اس کو آگ میں ڈال رہے ہیں؟ جواب ملا پوچھ لو۔ جبرائیلؑ اور ساتھ میکائیلؑ بارشوں کے فرشتے، دونوں آ گئے۔ آگ کے کنارے ایک جھولا لگایا ہوا تھا جس سے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنا تھا۔ اتنی بڑی آگ تھی کہ کوئی اس کے قریب جا نہیں سکتا تھا تو پھر ان کو اس میں پھینکتے کیسے؟ شیطان نے ترکیب سکھائی کہ ایک لمبا جھولا بناؤ اور اس کو دھکا دو اور جب وہ اُس طرف جائے تو اِس طرف سے کاٹ دینا تو وہ آگ میں گر جائیں گے۔ جبرائیلؑ نے پوچھا: "خلیل اللہ مدد کروں؟" فرمایا: "آپ اللہ کے حکم سے آئے ہیں؟" کہا: "نہیں، اجازت سے۔" اللہ کا حکم تو نہیں ہوا تھا، خود اجازت لے کر آئے تھے مدد کرنے۔ فرمایا: "آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔" پھر اللہ تعالیٰ نے براہ راست پوچھا: "ابراہیم! بچا لوں؟" اب بیچ میں سے فرشتوں کا واسطہ بھی ہٹ گیا۔ پھر بھی ابراہیم علیہ السلام نے نہیں کہا کہ بچا لیں۔ کہا: "اے اللہ! تیری مرضی ہے۔ ہم تو تجھ پر فدا ہیں۔ جلانا مقصود ہو تو جلا لے، بچانا مقصود ہو تو بچا لے۔" تو یہ وہ جذبہ ہوتا ہے کہ آگ میں پھینکا جا رہا ہے اور پرواہ ہی نہیں۔ اللہ کی غیبی مدد ہوتی ہے غیبی مخلوقات کے ذریعے، ہواؤں، طوفانوں کے ذریعے، فرشتوں کے ذریعے جبکہ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے براہ راست اپنے امرِ کُن سے مدد کی ہے۔ اللہ نے آگ کو حکم دیا: قُلْنَا یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰٓی اِبْرَاهِیْمَ (الانبیاء:۶۹)

اور ہم نے کہا کہ اے آگ ہو جا ٹھنڈی۔ اللہ تعالیٰ کا امر تو فقط کُن کہنے سے ہو جاتا ہے۔ آیت ہے اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَكُوْنُ (یٰس:۸۲) اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کا ارادہ کر لیں تو وہ کہتے ہیں ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کسی کام کے لئے Materials کی ضرورت نہیں ہوتی کہ اس چیز کو بنانے کے لئے کیا کیا چیزیں چاہئے ہوں گی، کیا ترتیبیں درکار ہوں گی، بس ارشاد ہو جاتا ہے کہ

'ہوجا' تو بس ہوجاتا ہے۔ ایسی قدرتوں والا رب ہے۔ اللہ نے ارشاد فرمایا۔ کُـوْنِـیْ بَـرْدًا یعنی ہوجا ٹھنڈی۔ اور اگر بات صرف بَرْدًا پر چھوڑ دیتے تو آگ اتنی ٹھنڈی ہوجاتی کہ پھر اس میں آدمی ٹھنڈ سے مرجاتا۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ اپنی کسی مخلوق کو حکم فرماتے ہیں تو وہ اس کو اپنی Extreme Degree پر پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس لئے ساتھ فرمایا وَسَلَامًـا یعنی ایسی ٹھنڈ جو سلامتی والی ہو، جس میں آدمی محفوظ رہے۔

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے بہت امتحانات لئے۔

وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرَاھِیْمَ رَبُّهٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ (البقرة: ۱۲۴)

اللہ تعالیٰ نے آزمایا ابراہیمؑ کو چند باتوں میں سو اس نے وہ پورا کر دکھایا۔ گھر بار چھڑوایا، بیوی بچے چھڑوائے، آگ میں جلایا ملک چھڑوایا، سب امتحانات تھے۔ جوان بیوی اور چھوٹے بچے کا کہا کہ صحرا میں چھوڑ کر آجاؤ۔ اللہ نے یہ سارے امتحانات لئے اور ابراہیمؑ نے پورا کر دکھایا تو پھر اللہ نے ان کو اپنا دوست بنالیا۔

وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰھِیْمَ خَلِیْلًا (النساء: ۱۲۵)

فرشتوں نے ایک دفعہ اللہ تعالیٰ سے کہا کہ آپ نے ان کو اپنا دوست بنایا ہوا ہے، ان میں ایسی کیا خاص بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اس کو آزمایا ہوا ہے۔ فرشتوں نے کہا اس کو ہم آزماتے ہیں کہ آیا واقعی اس قابل ہیں کہ ان کو دوست بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جاؤ آزمالو۔ ابراہیم علیہ السلام ایک جگہ بیٹھے اللہ کا ذکر کررہے تھے، ساتھ اپنا بکریوں کا ریوڑ چرا رہے تھے۔ ایک فرشتہ آیا اور اس نے ایک خاص طرز میں اور کشش والی آواز میں اللہ کا ذکر شروع کردیا۔ ابراہیم علیہ السلام کو اس کی طرف بڑی کشش ہوئی۔ فرشتے نے تھوڑی دیر ذکر کیا پھر چھوڑ دیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ''اور پڑھو نا!'' اس نے کہا: ''ایسے مفت میں تو نہیں پڑھتے۔ کچھ دو تو پڑھوں گا۔'' فرمایا: ''میرے آدھے جانور لے لو اور پڑھو۔'' اس فرشتے نے جانور لے لئے پھر پڑھنا شروع کیا اور کچھ دیر بعد پھر چپ ہوگیا۔ آپؑ نے فرمایا: ''اور پڑھو۔ بڑا مزا آرہا ہے محبوب کے نام میں۔'' جب آدمی کو عشق ہوتا ہے پھر محبوب کا نام سننے میں بھی مزا آتا ہے۔ مجنوں صحرا میں بیٹھا لیلیٰ لیلیٰ کررہا تھا۔ کسی نے پوچھا کیا کررہے ہو۔ کہا لیلیٰ کے نام کی مشق کررہا ہوں۔

گفت مشقِ نامِ لیلیٰ می کنم
خاطرِ خود را تسلی می دھم

ترجمہ: کہا لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں اور اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں۔

وہ لیلیٰ لیلیٰ کر رہا تھا، اگر اللہ اللہ کرتا تو پھر۔۔۔خیر فرشتے نے پھر جواب دیا کہ مفت میں تو نہیں کروگا، کچھ دوگے تو کروں گا۔فرمایا کہ باقی جانور بھی لے لو۔فرشتے نے پھر تھوڑی دیر ذکر کیا اور پھر چپ ہو گیا۔فرمایا اور پڑھو۔اس نے پوچھا کہ اب تمہارے پاس کیا ہے، کیا دو گے؟ فرمایا کہ کچھ بھی نہیں۔اس نے کہا کہ ساری زندگی میری غلامی کرو گے تو پڑھتا ہوں۔آپؑ نے کچھ دیر سوچا پھر کہا ٹھیک ہے تم پڑھو، ساری زندگی غلامی کریں گے۔ہم تو اُسی کے غلام ہیں تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔پھر فرشتوں کو معلوم ہوا کہ واقعی یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔

ایسا اللہ کے ساتھ عشق اور محبت کا تعلق ہو۔اللہ کی ذات پر آدمی غور کرے۔حضرت ڈاکٹر صاحب دامت برکاتہٗ فرماتے ہیں کہ مولانا اشرف صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ، اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے جس کا مطلب ہے ایسی ذات جس کی طرف انتہائی دل کی کشش ہوتی ہے۔باقی سب صفاتی نام ہیں۔ ہندوستان میں قرآن کا پہلا ترجمہ پوربی زبان میں ہوا ہے جو وہاں بولی جاتی تھی۔ایک بزرگ تھے جنھوں نے پوربی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا۔اس میں انھوں اللہ کے لئے جو لفظ لکھا وہ تھا 'من موہن'۔من کہتے ہیں 'دل' کو اور موہن 'کھینچنے والے' کو۔تو من موہن کا معنیٰ ہوا 'وہ ذات جو دل کو اپنی طرف کھینچے'۔محبت کرنے کی مختلف بنیادیں ہوتی ہیں۔انسان کو محبت ہوتی ہے یا تو کسی چیز کی خوبصورتی کی وجہ سے، یا کسی کمال کی وجہ سے، یا کسی احسان کی وجہ سے، مثلاً کوئی کسی کو تحفہ دے تو وہ آدمی اچھا لگنے لگتا ہے۔ہمارے بچوں کے ماموں آئے تو ان کے لئے چیزیں لائے۔میرا چھوٹا بیٹا کہتا ہے: ''دا ماموں ڈیر خہ دے'' یعنی یہ ماموں بہت اچھے ہیں، کیونکہ اس کو کچھ ٹافیاں، چاکلیٹ، کھلونے وغیرہ مل گئے۔جو آدمی احسان کرے اس سے بھی محبت ہوتی ہے۔

محبتِ جمالی، محبتِ کمالی، محبتِ احسانی، یہ مختلف وجوہات ہیں محبت کی۔مثلاً لوگوں کو کھلاڑی پسند ہوتے ہیں، فلاں بہت چھکے لگاتا ہے، وہ لوگوں کو پسند ہوتا ہے، کسی کو اداکار پسند ہوتے ہیں، کہ فلاں میں یہ کمال ہے۔ایک دفعہ میں حجام کے پاس بال بنانے گیا تو ایک لڑکا اس سے کہہ رہا تھا کہ میرے بال

اس طرح بناؤ، فلاں فلم میں فلاں اداکار نے اس طرح کا ہیئر سٹائل بنایا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ ہے عشق! ہم بھی دعوے کرتے ہیں کہ ہمیں حضور ﷺ سے محبت ہے۔ ہم سبھی کہتے ہیں کہ ہم حضور ﷺ سے محبت کرتے ہیں لیکن سب زبانی دعوے ہوتے ہیں۔ عشق تو اس لڑکے کو ہے جو اُس کی طرح بال بنانا چاہتا ہے جو اس کے دل کو بھایا ہوا ہے۔ کیا ہمیں حضو ﷺ کی ذات اس طرح بھائی ہوئی ہے؟ کیا ہمیں سنت کے ساتھ اس طرح محبت ہے؟ ہم ڈاڑھی تو رکھ رہے ہیں پر چاہئے کہ اس طرح رکھیں جس طرح حضور ﷺ نے رکھی۔ اپنے دل کی چاہت نہ کریں کہ ایسی اچھی لگتی جو برش جیسی چھوڑی ہوئی ہوتی ہے۔ ڈیرہ ببرہ خوند نہ کئی۔ بیا بہ سوک رالہ لور نہ راکئی۔ (زیادہ پھیلی ہوئی اچھی نہیں لگتی۔ پھر کوئی اپنی بیٹی کا رشتہ نہیں دے گا) جتنے بھی شیوخ اور پوری سنت ڈاڑھیوں والے ہیں آپ یقین رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو بہت خوبصورت بیویاں دیتے ہیں۔ ایک ساتھی نے بتایا کہ جب میں نے ڈاڑھی رکھی تو میری ایک رشتہ دار خاتون کہتی ہیں: ''او! گیرہ دی او ساتلہ۔ بیا بہ سوک لور نہ درکئی۔'' (اوہو! تم نے تو ڈاڑھی رکھ لی۔ پھر تو کوئی رشتہ نہیں دے گا تمہیں) میں نے کہا: ''ستا لور خو زہ نہ غواڑم۔'' (میں کوئی تمہاری بیٹی کا رشتہ تھوڑی مانگ رہا ہوں) اور میں ایسے کسی آدمی کے ہاں رشتہ بھی نہیں کرتا جو مجھے ڈاڑھی کی وجہ سے رشتہ نہ دے۔ ایسے آدمی کا تو ایمان ٹھیک نہیں ہے۔ ایسے آدمی کی بیٹی سے شادی کر کے مجھے کرنا کیا ہے، گوں کی بوری کو میں سنت پر ترجیح دوں کیا رشتوں کی کوئی کمی ہے۔ یہ شیطان کے وساوس ہوتے ہیں کہ یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے گا۔ حاجی صاحب دامت برکاتہٗ فرمایا کرتے ہیں نا کہ: ''دہ جینکو جینوٹارے ھلك نہ ای خوخ۔'' یعنی لڑکیوں کو لڑکی نما لڑکے پسند نہیں ہوتے۔ لڑکیوں کو تو 'خڑپڑ' Rough and Tough لڑکے پسند ہوتے ہیں کہ مرد تو لگیں نا! لڑکی نما تو ان کو اپنے جیسے لگتے ہیں۔ اسی لئے ایسے لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں زیادہ گھل مل جاتی ہیں کیوں کہ انھیں اجنبیت محسوس نہیں ہوتی، اپنے جیسے لگتے ہیں اس لئے گپ شپ میں زیادہ خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔

ایک دفعہ مفتی محمود صاحب رحمتہ اللہ علیہ تشریف لائے تو کچھ خواتین ممبرانِ اسمبلی (MNAs) نے منہ چھپالئے اور پردہ کرلیا۔ کسی نے کہا: ''مفتی صاحب! انھوں نے تو آپ سے منہ چھپالئے ہیں۔'' مفتی صاحب بڑے حاضر جواب تھے۔ ایسے برجستہ جواب دیا کرتے تھے کہ اگلے کو لاجواب کر دیتے تھے۔ انھوں نے جواب دیا: ''ہاں عورتیں مردوں سے پردہ کرتی ہیں۔'' ان کو ایسا لاجواب کر دیا کہ کچھ

بول ہی نہ سکے۔ اللہ والوں کو اللہ ایسے ایسے جواب بھی سُجھا دیتے ہیں۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ لڑکیاں اسی لئے ایسے لڑکوں کے قریب جاتی ہیں کہ ان کو کوئی Hesitation (ہچکچاہٹ) محسوس نہیں ہوتی۔ مردوں سے تو ان کو ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ مرد تو مرد ہوتا ہے۔ ببر شیر کو اللہ نے گلے کے گرد گھنے بال دیئے ہوئے ہیں کہ مرد ہے۔ یہ شیرنی کے نہیں ہوتے۔ اگر ببر شیر کے چہرے سے وہ کاٹ دو تو وہ کیا ببر شیر لگے گا۔ اب آپ کی مرضی ہے ببر شیر بنتے ہیں یا شیرنیاں بننا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پیدا تو آپ کو شیر کیا ہوا ہے لیکن اگر آپ شیر نہیں بننا چاہتے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اس میں اور بہت سی میڈیکل باتیں بھی ہیں جو ڈاکٹر بیان کرتے ہیں کہ ڈاڑھی کے کیا کیا فائدے ہیں۔ مجھے ایک دفعہ کسی نے کہا کہ گرمی میں تو ڈاڑھی آپ کو بہت تنگ کرتی ہوگی۔ میں نے جواب دیا کہ گرمی میں تو بالکل بھی تنگ نہیں کرتی۔ جب ہم وضو کر لیتے ہیں تو اس میں پانی رہ جاتا ہے اور یہ نمی کافی دیر تک ٹھنڈک کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ ڈاڑھی نہ ہو تو منہ فوراً ہی خشک ہو جاتا ہے اس میں زیادہ گرمی لگتی ہے۔ یہ تو شیطانی وسوسے ہوتے ہیں، آپ جس رُخ سے چاہیں ایک بات کو دیکھ لیں۔ خیر فوائد وغیرہ ہونا تو الگ بات ہے، ہمارے پیشِ نظر تو صرف یہ بات ہونی چاہئے کہ اللہ کا حکم ہے۔ ذاتِ ذوالجلال کا حکم ہے اور حضور ﷺ کی سنتِ مبارکہ ہے اور سنت طریقہ وہ ہوتا ہے جو حضور ﷺ نے کیا ہو۔ ڈاڑھی کے بارے میں جو حدیث ہے وہ حدیث قدسی ہے اور وہ جب صیغۂ امر میں آجائے تو واجب ہو جاتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

اَنۡهِكُوا الشَّوَارِبَ وَعْفُوا اللُّحیٰ　(جامع ترمذی)

یعنی مونچھوں کو خوب باریک کرو اور ڈاڑھیوں کو معاف رکھو یعنی چھوڑ دو، مت کاٹو۔ یہ بات امر کے صیغہ میں آئی ہوئی ہے کہ ڈاڑھی کو چھوڑ دو اور مونچھوں کو تراش لو۔ اب ڈاڑھی کو کتنا چھوڑنا ہے اس کی کوئی حد قرآن میں آئی ہے نہ حدیث میں۔ بس چھوڑنے کا حکم ہے۔ حضور ﷺ سے طول وعرض یعنی لمبائی چوڑائی سے ترشوانا تو حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی تالیف 'معارف الحدیث' میں نظر سے گزرا ہے، کاٹنے کی حد کا تعین اُس روایت میں نہیں۔ وہ چند ایک صحابہ کے عمل سے ثابت ہے کہ انھوں نے ڈاڑھی کو مُٹھی میں پکڑ کر نیچے سے کاٹا ہے۔ صحابی کا عمل جواز کا ثبوت ہوتا ہے۔ اس جواز کے پیشِ نظر ایک مُٹھی سے زیادہ کاٹنے کا ثبوت ہے۔ حضور ﷺ کی ڈاڑھی مبارک قدرتی طور پر ایسی متناسب تھی کہ ایک خاص حد تک پہنچ کر رک گئی تھی۔ خوبصورت، متناسب اور بھری بھری ڈاڑھی تھی۔ صحابہ کے اس عمل کی وجہ

سے ہم ایک مُٹھی سے اضافی ڈاڑھی کے بال کاٹتے ہیں جبکہ ایک مُٹھی سے کم ڈاڑھی تو ڈاڑھی ہی نہیں ہے۔ ڈاڑھی تو ایک مُٹھی ہے۔ مولانا محمد امیرؒ المعروف مولانا بجلی گھر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں قرآن سے ایک مُٹھی ڈاڑھی ثابت کرتا ہوں۔ جب موسیٰ علیہ السلام تورات کی تختیاں لے کر طور سے واپس آئے تو دیکھا کہ سامری نے ایک بچھڑا بنایا ہوا ہے اور لوگ اس کی پوجا کر رہے ہیں۔ وہ ہارون علیہ السلام کو اپنے پیچھے چھوڑ کر گئے تھے کہ ان کا خیال رکھنا۔ موسیٰؑ کا غصہ بہت مشہور ہے۔ وہ سخت غصے میں آ گئے اور ہارونؑ کو ڈاڑھی مبارک سے پکڑا اور اسے پکڑ کر جھٹکا دیا، چونکہ ان کے چھوٹے بھائی تھے گو پیغمبر بھی تھے۔ ڈاڑھی کو پکڑنے کے لئے اتنی ڈاڑھی تو ضرور ہونی چاہئے کہ پکڑی جا سکے۔ ہارونؑ سے فرمایا:

يَا ابْنَ اُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَ لَا بِرَأْسِي (طٰہٰ:۹۴)

اے میرے ماں کے جنے یعنی میرے بھائی مت پکڑ مجھے ڈاڑھی سے اور سر کے بالوں سے۔ جو ڈاڑھی پکڑی ہی نہ جا سکے تو وہ ڈاڑھی نہ ہوئی۔ تو یہ قرآن سے ثابت ہو گیا۔

اصل بات ہے اللہ کے ساتھ عشق کا تعلق ہونا۔ اللہ کے ساتھ بھی ضروری ہے اور حضور ﷺ کی ذات والا صفات کے ساتھ بھی ضروری ہے کیونکہ حضور ﷺ کا عشق ایمان کا حصہ ہے اور جزوِ ایمان ہے۔

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ .

تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک اس کو میں اپنے والدین سے اور اپنی اولاد سے اور سارے انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ اس لئے عشق رسول ﷺ ایمان کا حصہ ہے۔ جس کو یہ بات حاصل نہیں ہے اس کا ایمان کامل نہیں ہے۔ پھر عشق کے تقاضے ہیں جو میں نے آپ کو بتا دئے کہ وہ چلتا کیسے ہے، بولتا کیسے ہے، اٹھتا کیسے ہے، بیٹھتا کیسے ہے، اس کی صورت مبارک کیسی ہے، اس کا لباس کیسا ہے، عشق میں یہ ساری باتیں آدمی دیکھتا ہے، اس کی ادائیں اپنانے کی کوشش کرتا ہے، یہ سب عشق کی علامت ہوتی ہے۔ اللہ کی ذات سے عشق کرنے کے لئے انسان اس کے احسانات پر غور کرے۔ اللہ کو ہم دیکھ نہیں سکتے ورنہ اس کے حسن کا تو کوئی جواب نہیں ہے۔ یہ دنیا کے حسن تو اس کے آگے کچھ بھی نہیں ہیں۔ دنیا میں جتنا بھی حسن ہے یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حسن کو سو حصے کیا، ننانوے حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ حسن اس دنیا میں اتارا ہے اور اس کی وجہ سے ہمیں اتنی کشش ہوتی ہے خوبصورت چیزوں کی طرف۔ باقی ننانوے حصے حسن تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اب اندازہ کر

لیں کہ وہ خود کیا چیز ہوگی، کہ جب اس کی بنائی ہوئی چیزوں کی طرف ہمارا اتنا جذبہ ہوتا ہے تو اللہ کی طرف کیا ہوگا۔ حضرت عبدالواحد بن زید رحمتہ اللہ علیہ، جو حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں، ایک جہاد میں شریک تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان ہے جو بہت جوش و جذبے سے اور ذوق وشوق سے لڑ رہا ہے اور بڑھ بڑھ کر دشمن میں گھس رہا ہے اور حملے کر رہا ہے تو انھوں نے اس کو بلا کر پوچھا: ''جوان کیا بات ہے کہ آپ بڑے جذبے اور شوق سے لڑ رہے ہیں؟'' اس نے کہا: ''مت پوچھئے۔ رات کو خواب میں ایک حور کا دیکھا ہے۔ جب اس کے قریب جانا چاہا تو اس نے کہا کہ نہیں ابھی تم نے میرا مہر ادا نہیں کیا۔'' میں نے پوچھا: ''تیرا مہر کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''میرا مہر سر کٹانا ہے۔'' پھر کہتا ہے: ''بس اس کو دیکھا ہوا ہے، اب تو ہوش و حواس قابو میں نہیں ہیں، کب سر گرے اور اس کا مہر ادا ہو اور وہ قبضے میں آئے۔'' حضرت عبدالواحد بن زید رحمتہ اللہ علیہ تو اللہ والے تھے، انھوں نے کہا: ''جب حور کے لئے اتنا ہے تو حور والے کے لئے کیا ہوگا۔'' یعنی جب حور کے لئے اتنا جذبہ ہے تو پھر وہ کہ جس نے اس حور کو پیدا کیا اس کے لئے کیا ہونا چاہئے۔ انسان اللہ کے حسن کا تو اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔ پھر کمالات کے کیا کہنے ہیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کے عطا و نوال یعنی احسانات پر غور کرے کہ صحت دی ہوئی ہے، زندگی دی ہوئی ہے، کیا کیا نعمتیں دی ہوئی ہیں۔

وَ اِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡہَا (النحل: ۱۸)

کہ اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے، اتنے تو اس کے ہمارے اوپر انعامات اور احسانات ہیں۔ اگر اپنے بدن پر غور کریں تو ۳۰۶ تو اس میں جوڑ ہیں۔ ایک ایک جوڑ پر غور کریں، ایک ایک عضو پر غور کریں، ایک آنکھ پر ہی غور کریں۔ آنکھ کا لینز اگر خراب ہو جائے تو آج کل پندرہ بیس ہزار کا لگتا ہے اور اس طرح کا کام پھر بھی نہیں کرتا۔ ہماری آنکھ کے اندر ایک لینز ہے شیشے جیسا جس سے ہمیں نظر آتا ہے پر وہ بنا ہوا Silicon (سلیکان) کا نہیں ہے۔ یہ لینز Protein (حیاتین) کا بنا ہوا ہے اور Flexible (لچکدار) ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے Focusing (فوکس کرنے) اور Adjustment کا بندوبست کیا ہوا ہے۔ آپ دور دیکھنا چاہیں تو دور کے لئے سیٹ ہو جاتا ہے اور اگر نزدیک دیکھنا چاہیں تو نزدیک کے لئے، اور اتنا جلدی کہ انسان کو اندازہ بھی نہیں ہوتا اور ذرا آگے پیچھے نہیں ہوتا۔ یہ لینز عمر کے ساتھ ساتھ Opaque (غیر منعکس) یعنی گدلا ہونا شروع ہو جاتا ہے، پھر سے اس سے واضح نظر نہیں

آتا۔ پھر ڈاکٹر کہتا ہے کہ آپ کی آنکھوں کے آگے پردہ آگیا ہے یعنی لینز گدلا ہو گیا ہے۔ اسے Cataract (سفید موتیا) کہتے ہیں۔ تب اصلی لینز نکال کر مصنوعی لگا دیتے ہیں پر اس میں Focusing اور Adjustment نہیں ہوتی جو اللہ کے بنائے ہوئے میں ہوتی ہے۔ یہ تو آنکھ کے صرف ایک لینز کی بات ہے (پھر اصل چیز آنکھ کے اندر کا پردہ Retina ہے جس کا کوئی بدل ہے نہ کوئی خاص علاج)۔ ایک Knee Joint (گھٹنا) آج کل تبدیل ہوتا ہے ڈھائی لاکھ کا اور ہمارے ایک دوست نے اپنی والدہ کے دونوں گھٹنے پانچ لاکھ میں تبدیل کروائے۔ پھر بھی وہ اصل کی طرح کام نہیں کرتے۔ (محدود سا کام کرتے ہیں، کئی احتیاطوں اور تکلیف کے ساتھ) دل کا ایک ایک وال لاکھوں روپے کا ہے۔ اسی طرح آپ حساب کرنا شروع کر دیں سر سے لے کر پاؤں تک تو کیا آپ کا بدن اربوں روپے کا ہے یا نہیں۔ مفت میں دیا ہوا ہے۔ آپ سے کسی نے پیسے لئے ہیں؟ صرف آپ کو اس مشین کے چلانے کے لئے تھوڑے سے ایندھن کی ضرورت ہے، کھانا جو آپ اسے کھلاتے ہیں اور پانی پلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ موبل آئل کبھی نہیں بدلنا پڑتا۔ آپ کے جوڑوں میں Synovial Fluid ایک باقاعدہ موبل آئل ہوتا ہے جو کہ ایک لیسدار مایع ہے اور یہ جوڑوں کو Lubricate (چکنا) رکھتا ہے تاکہ آپس میں رگڑ نہ کھائیں۔ جن لوگوں کا یہ مایع ختم ہو جاتا ہے ان کو جوڑوں کی ایک بیماری Arthritis ہو جاتی ہے جو کہ پھر ٹھیک ہی نہیں ہوتی کیونکہ ان کا یہ موبل آئل تھوڑا سا خشک ہو جاتا ہے۔ آپ کی جلد کچھ عرصہ بعد نئی ہو جاتی ہے۔ آپ کو اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ جب نہاتے دھوتے ہیں تو اوپر کے Cells (خلیئے) Shed off ہوتے (جھڑتے) رہتے ہیں اور نیچے سے نئی جلد نکلتی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا Maintenance کا بندوبست کیا ہے کہ خود ہوتی رہتی ہے۔ اربوں کھربوں کا تو بدن مفت میں دیا ہوا ہے۔ باقی احسانات کیا صرف اپنے بدن پر ہی غور کریں تو اللہ تعالیٰ سے آدمی کو عشق ہو جائے۔ آپ کے ہر گردے میں ایک گردہ اضافی ہے۔ ایک گردے میں دس لاکھ نالیاں (Nephrons) ہوتی ہیں جن میں سے پانچ لاکھ کام کرتی ہیں اور پانچ لاکھ Reserve میں رہتی ہیں۔ جب ایک خراب ہو جائے تو اس کی جگہ نئی کام شروع کر دیتی ہے۔ لہٰذا ہر گردے میں ایک گردہ اضافی ہے۔ گویا آپ کے چار گردے ہوئے۔ دو کام کر رہے ہوتے ہیں دو اضافی (Spare) ہوتے ہیں۔ جوں ہی کوئی نالی بند ہوتی ہے نئی نالیاں کھلتی جاتی ہیں۔ اسی طرح آپ کے ہر ایک عضو میں اتنے Reserve ہیں کہ اندازہ نہیں اس لئے میڈیکل کو جو کوئی غور سے پڑھے

اس کا ایمان مزید مضبوط ہو جاتا ہے۔ اتنے احسانات کیا کم ہیں کہ ایسی ذات سے محبت نہ کی جائے۔ تو دوسرے درجے کا تعلق عشق کا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ سے عشق ہو جائے۔

اس سے اوپر کا درجہ پھر غیرت کا درجہ ہے کہ انسان کو اللہ کے ساتھ غیرت کا تعلق ہو جائے۔ یہ محبت سے بھی اوپر کا درجہ ہے۔ جب اللہ کی نافرمانی ہو رہی ہو تو آدمی کو ایسی غیرت آتی ہے کہ اپنا سر کٹا لے یا دوسرے کا سر کاٹ لے۔ باطل کو دیکھ کر اتنا آدمی کو غصہ آئے۔ حُب لِلّٰہ یعنی اللہ کے لئے محبت آدھا ایمان ہے اور بُغض فِی اللّٰہ آدھا ایمان ہے یعنی اللہ کے لئے نفرت کرنا۔ اپنی ذاتی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ کے لئے، اس کے اس خراب عمل سے جو اللہ کی نافرمانی ہے اس کی وجہ سے۔ یہ نفرت بغض فی اللہ بھی آدھا ایمان ہے۔ یہ کوئی ایسی ہی بات نہیں بلکہ بہت ضروری بات ہے۔ وتر کی نماز میں ہم سب پڑھتے ہیں پر کرتا کوئی بھی نہیں ہے۔ پڑھنے میں ہے پر عمل میں نہیں ہے۔ بلکہ اکثر کو معنیٰ ہی نہیں آتا۔ دعائے قنوت میں جو کہتے ہیں

وَنَخۡلَعُ وَنَتۡرُکُ مَنۡ یَّفۡجُرُکَ

یعنی ہم چھوڑ دیتے ہیں، ان سے خلع کر لیتے ہیں، علیحدگی کر لیتے ہیں، بائیکاٹ کر لیتے ہیں اور ترک کر لیتے ہیں ان کو، چاہے وہ کوئی بھی ہوں جو آپ کی نافرمانی کرتا ہے۔ کیا یہ ہم کرتے ہیں؟ نہیں کرتے۔ کتنے ہمارے تعلقدار ہیں جو اللہ کی نافرمانی کھلم کھلا کر رہے ہوتے ہیں ان سے ہم تعلقات نہیں چھوڑتے، بائیکاٹ نہیں کرتے۔ یہ بہت ضروری بات ہے۔ ہم اللہ سے تو روزانہ کہتے ہیں کہ جو تیری نافرمانی کرتا ہے اسے ہم چھوڑتے ہیں اور اس کا ہم بائیکاٹ کرتے ہیں، پر عملاً کرتے نہیں، صرف منہ زبانی، باتیں ہی ہیں۔ اللہ کی نافرمانی کو دیکھ کر اور باطل باتوں کو دیکھ کر آدمی کو غیرت آئے کیونکہ بے غیرت آدمی کا کوئی بھی عمل قبول نہیں ہے۔ مولانا ڈاکٹر عبیداللہ صاحب نے حبطِ اعمال والا مضمون بیان کیا ہوگا۔ دیوث، بے غیرت، جسے پشتو میں دؤث کہتے ہیں، یہ عربی کا لفظ ہے اور دیوث آدمی کی فرض، واجب، نفل کوئی عبادت قبول نہیں ہے، جس کو اللہ کی نافرمانی پر اور اپنی عورتوں کے لحاظ سے غیرت نہ آتی ہو۔ غیرت ایمان کا جزو ہے، اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہے اور جب ایمان کامل نہ ہو تو عبادات زیادہ فائدہ نہیں دیتیں۔ ایمان شرط ہے۔ کئی جگہ آیا ہے اَلَّذِیۡنَ آمَنُوۡا وَعَمِلُوۡا الصَّالِحَاتِ یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، تو پہلی شرط ایمان کی ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ (النحل:۹۷)

تو ساتھ فوراً شرط ایمان کی ہوتی ہے، کہ مردوں عورتوں میں سے جس نے نیک عمل کیا اور جو ایمان والا بھی ہو۔ ایمان کے جتنے اجزاء ہیں، صفائی، حیاء، غیرت، صداقت، شجاعت وغیرہ ان میں جتنی جتنی کمی ہوتی جائے گی اتنی اس آدمی کے ایمان میں کمی ہے۔ آدمی میں شجاعت نہیں ہے، امانت دیانت نہیں ہے، حیاء غیرت نہیں ہے، صفائی نہیں ہے، ظاہری و باطنی دنوں طرح کی صفائی جسے تزکیہ بھی کہتے ہیں، سب اجزائے ایمان ہیں، جس میں جو جتنے کم ہیں اتنا اس کا ایمان کمزور ہے۔ عمل ایمان کی کمی کو پورا نہیں کرسکتا۔ ایمان میں اعمالِ صالحہ سے تقویت تو آتی ہے لیکن اگر ایمان میں کمی ہے تو اس کمی کو عمل پورا نہیں کرسکتا۔ یہ ہے اللہ کے ساتھ غیرت کا تعلق۔

تعلقات تو ہم نے بیان کر دئے، یقین کا تعلق، محبت کا تعلق اور غیرت کا تعلق۔ اب یہ ہوگا کیسے؟ سب سے پہلے تو آدمی نیت کرے۔ جس طرح آپ لوگ نیت کر کے دس دن فارغ کر کے آئے ہیں۔ اب یہاں سے جانے سے پہلے اس بات کی نیت کریں کہ ہم اللہ کے ساتھ خاص تعلق بنائیں گے۔ عام تعلق تو ہم سب کا ہے، خاص عشق و محبت والا تعلق بنائیں گے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ۔ اعمال کا دار و مدار تو نیت پر ہے اس لئے جب آدمی کسی کام کی نیت اور ارادہ کر لے تو پھر اس کے لئے اسباب کا بندوبست شروع کر دیتا ہے۔ آدمی گھر بنانا چاہے تو پہلے پیسے جمع کرنا شروع کرتا ہے۔ پیسے ہو جائیں تو پھر جاتا ہے کسی آرکٹکٹ (Architect) کے پاس کہ نقشہ بنا دے، پھر قیصر صاحب کے پاس آتا ہے کہ اس کا سٹرکچر کیسے بنائیں، پھر معماروں کو ڈھونڈتا ہے۔ لیکن یہ سارے بندوبست کرنے سے پہلے نیت اور ارادہ کیا ہوتا ہے کہ گھر بنانا ہے۔ نیت ہی نہ ہو ایک کام کی تو بس پھر بیٹھا رہے۔ تو پہلے یہ نیت کر لیں کہ اللہ کے ساتھ تعلق قائم کرنا ہے۔ اللہ کے ساتھ خاص قرب اور محبت والا تعلق قائم کرنا ہے۔ جب نیت ہو جائے تو پھر دوسرے درجے میں کیا کرے؟ اگر آپ نے قیصر صاحب سے تعلق بنانا ہے تو اس کے لئے کیا باتیں ضروری ہیں؟ جو اُن کو پسند ہو اس کو اپنائیں گے اور جو ان کو ناپسند ہو اس کو چھوڑنا پڑے گا۔ ویسے ہی تو تعلق نہیں بنتا نا۔ اگر قیصر صاحب ایک بات پر خفا ہوتے ہیں اور میں جا کر ان کے سامنے وہی کام کروں تو وہ کہیں گے جاؤ اپنا کام کرو۔ اسی طرح اگر اللہ سے تعلق بنانا ہو اور کام سارے ایسے کریں جس سے اللہ ناراض ہو تو کیسے تعلق بنے گا؟ تو یہ معلوم کیا جائے کہ اللہ کس بات سے خوش ہوتا ہے اور کس بات سے خفا

ہوتا ہے۔ اگر قیصر صاحب سے کسی کو کوئی کام پڑ جائے تو پہلے معلومات کرے گا کہ کس چیز سے خوش ہوتے ہیں، کس چیز سے خفا ہوتے ہیں، پھر اس کا بندوبست کرے گا۔ جب یہ معلومات ہو جائیں پھر ہمت کر کے عمل کرنا ہے۔ آپ نے صرف نیت کی اور معلومات جمع کیں اور بس بیٹھ گئے کہ جی خیر سے طریقہ تو ہمیں معلوم ہو گیا ہے۔ معلومات ہو جانے کے بعد اگر آدمی ہمت نہ کرے اور عمل نہ کرے تو کیا کچھ حاصل ہو جائے گا؟ نہیں ہو گا۔ تیسرے نمبر پر پھر عمل ہے۔ نیت، علم اور عمل۔ نیت ٹھیک ہو جائے، ارادہ کر لے، پھر معلومات حاصل کر لے کہ اللہ کس بات سے خفا ہوتا ہے اور کس بات سے خوش ہوتا ہے، اپنے فیصلے نہ کرے مثلاً میرا جی چاہتا ہے کہ یہ کام کروں، دل کی نہیں ماننی، اللہ کی ماننی ہے، اس پر عمل کرنا۔ یہ تین کام ہو گئے، نیت علم اور پھر عمل۔

جب معلومات ہو گئیں کہ اللہ کن باتوں سے خوش اور کن باتوں سے خفا ہوتا ہے اور پتہ چلا کہ ہم نے تو آج تک اتنے سارے کام اللہ کو ناراض کرنے والے کئے ہوئے ہیں تو پھر کیا کیا جائے تو اس کا طریقہ توبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ بنایا ہوا ہے۔ انسان جوں ہی ندامت ظاہر کر کے، آئندہ نہ کرنے کا پکا ارادہ کر کے، اخلاصِ دل کے ساتھ توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ فوراً معاف فرما دیتے ہیں۔ گزشتہ پر توبہ کر کے معاف کرا لے اور جس کا ازالہ ممکن ہو اس کا ازالہ کرے۔ توبہ کی چوتھی شرط یہ ہے کہ جس کا ازالہ ممکن ہو اس چیز کا ازالہ کرے۔ اگر نماز نہیں پڑھیں، اب حساب کرے کہ کتنی رہتی ہے اور ان کی قضا ادا کرے۔ روزے نہیں رکھے تھے تو اب ان کی قضا کرے۔ کسی کا حق دبایا ہوا ہے، کسی کی زمین دبائی ہوئی ہے، کسی کے پیسے چرائے ہوئے ہیں وہ واپس کرے۔ جن جن گناہوں اور خطاؤں کا ازالہ ممکن ہو ان کا ازالہ کیا جائے۔ جن باتوں کا ازالہ ممکن نہیں ہے ان پر توبہ کی جائے اور مسلسل استغفار کرتا رہے تو امید ہے اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا۔

ان سب باتوں کے بعد جو ضروری بات ہے وہ اللہ والوں کی صحبت ہے۔ اس سے کام آسان ہو جاتا ہے۔ جب اللہ سے تعلق بنانے کا ارادہ کر لے تو ایسے لوگوں کو ڈھونڈنا چاہیئے جن کا تعلق بنا ہوا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان کو طریقے اور گر آتے ہیں، وہ بتاتے رہتے ہیں تو انسان کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ صرف معلومات سے کام ہوتا نہیں۔ میڈیکل کی ساری کتابیں پانچ سال گھر بیٹھ کر پڑھ لیں تو کوئی بھی ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے پروفیسر سے سننا اور سیکھنا ضروری ہوتا ہے، اس کی مجلس میں رہنا

ضروری ہوتا ہے۔ میڈیکل کالج میں سب کو تو داخلہ ملتا بھی نہیں ہے۔ پر یہ ایسا دربار ہے جہاں سب کو داخلہ ملتا ہے، جو بھی آجائے۔ ڈاکٹر بننے کے لئے تو شرائط ہیں ورنہ داخلہ ہی نہیں ملتا۔ پھر پانچ سال گزارنے ہوتے ہیں۔ ان کتابوں کو ان پروفیسروں سے پڑھنا ہوتا ہے، ان سے سننا ہوتا ہے اور امتحان میں بتانا ہوتا ہے تاکہ دیکھ لیں وہ کتابیں ٹھیک ٹھیک پڑھی اور سمجھی ہیں کہ نہیں۔ چانچ سال کے پڑھنے اور امتحانوں کے بعد چھٹے سال میں ان کی ہاؤس جاب میں Training (عملی تربیت) کرتے ہیں۔ پروفیسر اپنے سامنے ساری چیزیں کرواتا ہے۔ آپریشن اپنے سامنے کرواتا ہے۔ کتابوں میں تو لکھا ہوا ہے کہ اپینڈکس کا آپریشن اس طرح کرتے ہیں لیکن جب تک پروفیسر کو دس مرتبہ دیکھا نہ ہو کہ وہ کیسے کرتا ہے اور دس مرتبہ اس کی زیرِ نگرانی کیا نہ ہو تو کوئی آپ کے ہاتھ میں بلیڈ نہیں دے گا۔ جب پروفیسر اپنی زیرِ نگرانی کرا کرا سے کہہ دے کہ اب ٹھیک ہے، تم کر سکتے ہو تب وہ کرتا ہے۔ کامل استاد کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اس لئے اللہ کا تعلق حاصل کرنے کے لئے اللہ والوں کی صحبت ضروری بات ہے۔ اگر انسان خود سے کرنا چاہے تو بڑا مشکل کام ہے، اس پر وقت بھی بہت زیادہ لگتا ہے، تکلیفیں زیادہ ہوتی ہیں اور پھسلنے کے بھی امکانات ہوتے ہیں۔ اس لئے کامل راہنما کی ہدایات پر آدمی چلے تو کام آسان اور جلدی ہو جاتا ہے۔ تو نیت، علم اور عمل کے بعد چوتھی بات اہلُ اللہ کی صحبت ہے۔ اس سے بہت جلد انسان پر رنگ چڑھ جاتا ہے۔

ایک نوجوان کا ایک لڑکی کے ساتھ دل لگ گیا اور وہ اسے پسند آگئی۔ اس نے اسے شادی کا پیغام بھیجا۔ عربوں میں آسان ہوتا ہے، کسی کو براہ راست بھی شادی کا پیغام دیا جا سکتا ہے۔ ہماری اپنی روایات ہیں اس لئے ہمارے علاقے میں اس طرح نہیں کرنا چاہئے۔ اس نوجوان نے بھی جا کر لڑکی سے کہہ دیا کہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی کوئی غلط نیت نہیں تھی کہ افیئر چلائیں اور غلط تعلقات بنائیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ٹھیک راستے کو اپنانا چاہا۔ لڑکی نے کہا کہ میں تم سے نکاح کروں گی لیکن شرط یہ ہے کہ تم چالیس دن تک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ نماز پڑھو، پھر میں شادی کرلوں گی۔ اس نوجوان نے چالیس دن تک حضرت عمرؓ کے پیچھے تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ نماز پڑھی تو دل میں اللہ کی محبت پیدا ہوگئی اور اس لڑکی کی محبت ہی اس کے دل سے نکل گئی۔ کچھ عرصے بعد لڑکی نے نوجوان کے بارے میں معلوم کروایا تو اس نے کہا کہ بس اب تو ایسی ذات کے ساتھ

محبت ہوگئی ہے کہ آپ کی محبت نہیں رہی۔ اللہ کے ساتھ محبت ہوگئی ہے۔ اب وہ بات رہی ہی نہیں۔ جس نے اِس کو بنایا ہے میں اُس کے ساتھ کیوں نہ محبت کروں۔

ایک چور نے سوچا کہ کیا ایسے ہی چھوٹے چھوٹے گھروں میں چوریاں کریں، کسی صحیح جگہ ہاتھ ماریں کہ کام بن جائے۔ اس نے ایک دن محل میں چوری کا پروگرام بنایا۔ آدھی رات کو جب محل میں داخل ہوا تو دیکھا کہ بادشاہ اور ملکہ جاگ رہے ہیں اور آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ اس نے سنا کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ شہزادی جوان ہوگئی ہے، اب اس کی شادی کرنی چاہیئے، اس کے لئے کیسا لڑکا ڈھونڈیں۔ مشورہ یہ ہوا کہ مال و دولت کی تو ہمیں کوئی کمی نہیں ہے لہٰذا اس کے لئے کوئی ایسا اللہ والا بندہ ڈھونڈیں جو بہت تقویٰ والا ہو اور جس کا اللہ سے خاص تعلق ہو کیونکہ یہ بہت ضروری ہے کہ انسان کے پاس دین ہو اور اس کے لئے ہم اپنی جامع مسجد کے امام قاضی صاحب سے کہیں گے کہ ایسا کوئی لڑکا ڈھونڈیں۔ چور نے جو یہ بات سنی تو چوری کا ارادہ ترک کر کے واپس آ گیا اور قاضی صاحب کی مسجد میں اعتکاف پر بیٹھ گیا۔ قاضی صاحب دیکھتے رہے کہ نوجوان ہے اور سارا دن ذکر و تلاوت میں مشغول ہے اور بس دوسرا کوئی کام ہی نہیں ہے۔ ایک مہینے تک جو قاضی صاحب اس کا مشاہدہ کرتے رہے تو انھیں اندازہ ہوا کہ شہزادی کے رشتے کے لئے اس سے بہتر تو کوئی آدمی نہیں ہے۔ ایک دن جب یہ چور بیٹھا ذکر وفکر کر رہا تھا تو قاضی صاحب اس کے پاس گئے اور کہا کہ نوجوان مجھے بادشاہ نے شہزادی کے لئے رشتہ ڈھونڈنے کا کہا ہوا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کا نام پیش کر دوں۔ ذکر ایسی چیز ہے جو آدمی کو اللہ کا بنا دیتی ہے۔ یہ جو ذکر صوفیاء کرواتے ہیں اسی لئے کرواتے ہیں۔ یہ آدمی کو غلط طرف چھوڑتا ہی نہیں ہے۔ خود ہی ٹھیک کر دیتا ہے۔ حضرت خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ بغیر توجہ کے بھی ہو تو ذکر کرتے رہنا چاہیئے، اس کا بھی فائدہ ہوتا ہے۔ اس نوجوان نے جو اتنا عرصہ اللہ تعالیٰ سے لو لگائی تھی تو اللہ نے اسے اپنے لئے قبول کر لیا تھا۔ اللہ قبول فرمالیں تب فیصلے ہوتے ہیں۔ چور نے جواب دیا: ''قاضی صاحب! آیا تو میں بھی اسی نیت سے تھا لیکن اب مجھے شوق نہیں رہا۔ اب میں نہیں کرنا چاہتا۔'' دل میں جب اللہ آ جائے تو پھر باقی باتوں کا خیال ہی نہیں رہتا۔ کوئی اور چیز پھر دل میں سماتی ہی نہیں ہے۔

انسان کا خدا کے ساتھ ایسا محبت کا تعلق ہونا چاہیئے کہ نیکی آسان ہو جائے اور گناہ مشکل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!